لذتِ آزار
PP
PUNCH PUBLISHERS

آزاد

پہلی بار ـــــــــ سنہ ۱۹۶۸
تعداد اشاعت ـــــــــ ۱۱۰۰
قیمت ـــــــــ تین روپے
شاہی پریس لکھنؤ

احمد جمال پاشا

پنچ پبلشرز:- سردری منزل، کچّا احاطہ، لکھنؤ (یو۔پی)

فہرس

لذّتِ آزار کے مضامین بالکل ویسے ہی ہیں جیسا کہ آپ انہیں پائیں گے۔ اگر کسی مضمون کے مطالعہ کے دوران آپ کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ جائے تو اسے مزاحیہ فرض کر لیجئے گا۔ اگر سر سے گزر جائے تو اس کا شمار طنز میں کیجئے گا ورنہ سمجھ جائیے گا کہ یہ محض "انشائیہ" ہے۔

مہنگائی، ملاوٹ اور زمانے کی سنگینی کے آلہ آپ کچھ کچھ قائل ہوں تو جن مسائل اور مصائب کو ظرافت کے قالب میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان کی روح میں جھانکنے کی کوشش کیجئے گا ورنہ تفریح سمجھ کر آگے بڑھ جائیے گا۔

اس کا فیصلہ آپ پر چھوڑتا ہوں کہ میں "ترقی پسند" ہوں "جدیدیت پسند" یا "اذیت پسند" یا بقول شخصے "ہوں بھی اور نہیں بھی ہوں"

آخر میں آپ سے یہ فرمائش بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ اپنی پسند نا پسند اور مفت کے مشوروں سے بھی نوازیں۔

آپ کا

سروری منزل کچا احاطہ
لکھنؤ، (یو۔ پی)

احمد جمال پاشا

ہم نے ریسرچ کی

کسی نہ کسی طرح ایم اے کر لینے کے بعد بھی جب کسی نے ہم کو ٹکے کا نہ پوچھا، ہمارے نام کی تختی میں "ایم اے" کا دم چھلا بھی ہماری شخصیت میں چار چاند نہ لگا سکا تو ہم نے اس خیال سے کہ:-

روٹی تو کما کھائے کسی طور مچھندر

بعد اشک و رشک بدھو، جمن، وفاتی اور گھسیٹے سے شومیٔ تقدیر کا شکوہ کرتے ہوئے ان کی کامیابی اور کامرانی کے اسباب دریافت کیے۔

ہماری چوپال کے آزیبل ممبران نے متفقہ طور پر سمجھایا کہ "چونکہ یہ دلی نہیں اور بستی ہے اس لیے اگر ڈگی بجانے اور پیٹ پالنے کے لیے یہاں آپ نے ایم اے کیا وہاں لگے ہاتھوں ایک عدد پی ایچ ڈی بھی کر ڈالیے۔

پی ایچ ڈی کے سلسلے میں مزید چھان بین اور ناصی تحقیق کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ پیٹ اچھی طرح پالنے اور باقاعدہ سر چھپانے کے لیے

ایک عدد پی ایچ ڈی کا ہی ڈالا جائے۔

کافی نظریں دوڑانے کے بعد ہماری نظر اپنے لنگوٹیے بزرد پر پڑی جو خیر سے اب پی ایچ ڈی تھے اور ڈاکٹر بندے علی خاں بی اے آنرز ایم اے پی ایچ ڈی بھی کہلاتے تھے۔ بندے علی نے پہلے تو پٹھے پر ہاتھ نہ رکھنے دیا۔ مگر جناب ہم بھی کچی گولیاں کھیلے ہوئے نہ تھے۔ لہٰذا آخر وہ ہماری پھٹکی میں آ گئے اور اپنے "ٹریڈ سیکریٹ" بتانے پر راضی ہو گئے اور ہمیں مشورہ دیا کہ

"عربی، فارسی یا انگریزی میں جس موضوع پر کام ہو چکا ہو، اسی موضوع پر اردو میں تم بھی کام کر دو، اس کے لیے کوئی پرانی اور گمنام یا کمیاب تھیسس تلاش کر لی جائے گی۔ بس تم ایک اچھا سا مترجم تلاش کر لو۔ ڈاکٹریٹ پیسے کا کھیل ہے۔ ڈاکٹر تو تم سمجھو ہو گئے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ جس موضوع پر کسی نے کام کیا ہو، مگر باقاعدہ ڈاکٹر بننے کے خیال سے کام نہ کیا ہو۔ اس کی اس تلاش و تحقیق کو تم تاش کے پتوں کی طرح پھینٹ کر ایک نئی لٹریچر بنا دو، بس وہی تمھارا بالکل اوریجنل کام سمجھا جائے گا۔

بدھو کو پڑھانے کے لیے یونیورسٹی جانے کی جلدی تھی، مگر چلتے چلتے سمجھا گئے کہ "بھیا، پڑھتا لکھتا کون ہے۔ یہاں سب چلتا ہے۔ آپ ایک حرف نہ پڑھیے مگر شور مچاتے رہیے کہ پڑھتے پڑھتے مرے جا رہے ہیں مگر اس کے لیے تھوڑی سی اوپری ٹیپ ٹاپ ضروری ہوتی ہے۔ میاں آخر دنیا داری بھی تو کوئی چیز ہے۔"

اس کے بعد ہماری بہت کچھ سمجھ میں آگیا۔ اور کلید کامیابی ہاتھ آتے ہی ایک لخت اپنا چولا بدل دیا۔

صاحب! دیکھتے۔ دیکھتے ہماری کا یا پلیٹ ہوگئی۔ ڈاڑھی مونچھیں صاف ملٹری کی نیلام شدہ کمانی دار عینک کی جگہ خالص اٹبلکچول مارکہ سیاہ چشمے نے لی، آنکھیں چرانے کے ساتھ ساتھ اپنی خاندانی شیروانی کو خیرباد کہہ کر سوٹ، بوٹ اور ایک عدد جہازی مارکہ پورٹ فولیو سے لیس ہوگئے۔ پچھلی بے فکری کی جگہ چہرے پر غور و فکر کے آثار بوریت کی حد تک طاری ہوگئے۔ یاروں کے جرگوں اور دوستوں کے جھمٹ میں منڈ گشتی ایک دم ختم کر کے نہایت پھونک پھونک کر قدم رکھنے لگے۔ اب ہماری ساری کوشش اور توجہ اپنے نگراں اور ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ صاحب کو شیشے میں اتارنے پر صرف ہونے لگی۔

جیسے ہی ہمیں پی ایچ ڈی میں داخلہ ملا۔ ہم نے کام شروع کرنے کے بجائے، کہ تحقیق کا میدان سر کرتے یہ پتہ لگانا شروع کیا کہ یونیورسٹی کی کس، کس مد سے کتنی کتنی رقم، کس کس شکل میں اینٹھی جا سکتی ہے، غرض صاحب پہونچتے ہی کافی کاغذی گھوڑے دوڑائے اور استادی کے وہ ہاتھ دکھائے کہ کبھی کتابوں کے لیے رقم لیے چلے آرہے ہیں تو کبھی دوسری یونیورسٹیوں اور لائبریریوں سے امداد فراہم کرنے کا کھڑاگ بنا رہے ہیں۔ کبھی بورسری لا رہے ہیں تو کبھی اسکالرشپ منظور کروانے کے لیے ڈین اور وائس چانسلر صاحب کے دفتر کا گھیرا ڈالے ہوئے ہر ہر موڑ پر اپنی صورت ان کو پہنچوا

رہے ہیں۔

اسکالرشپ ملنے کے بعد ہم ڈپارٹمنٹ اور لائبریری میں نظر آئے تو ڈاکٹر سید علی خاں بی اے آنرز ایم اے۔ پی۔ ایچ ڈی کو بے ساختہ ہماری سادہ لوحی پر ترس آگیا اور بڑے پیار سے ہمیں الگ لے جاکر سمجھایا کہ "آخر یوں جان دینے سے کیا فائدہ، جب پیٹ کی خاطر سارا دھندا پھیلایا ہے تو پھر جان ہلکان کرنے سے حاصل۔ یونیورسٹی آنے سے نہیں روکتے، مگر بس تبدیلی آب و ہوا کی حد تک مناسب ہے۔ لائبریری بھی جاؤ، بلکہ بے شک جاؤ، مگر صرف احباب کو تلاش کرنے، شعبے میں بھی آؤ، مگر محض "آئی ڈیا" بنانے اور اساتذہ کی مزاج پرسی کے لیے تاکہ سب سے تعلقات خوش گوار رہ سکیں۔ رہی ریسرچ تو اس کے لئے ابھی عمر پڑی ہے، کوئی گاڑی تھوڑی چھوٹی جا رہی ہے۔ برخوردار جانتے نہیں، اسکالرشپ پانے کے دوران کام کرنا بدشگونی سمجھا جاتا ہے اس زمانے کا پڑھنا لکھنا نہیں بلکہ سوشل لگانا اور دربارداری کام آتی ہے۔ میاں بس صدر شعبہ کو مکھن لگانے میں کسی قسم کی کوئی کمی نہ ہونا چاہیئے ورنہ بڑی بڑی نزاکتیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ بلکہ میری مانو تو یونی ورسٹی آؤ مگر صرف اسکالرشپ کا چیک کیش کرانے کی حد تک"

اس پرخلوص بات چیت کا انتہائی خوش گوار اثر ہم پر ہوا اور ہم نے ڈپارٹمنٹ یا لائبریری جانے کے بجائے یونیورسٹی کے ہونے والے جلسے جلوس اور کھیل تماشوں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ احباب کی کثرت

ادرا کار شپ کے زور نے ہماری شخصیت بڑی پُروقار بنا دی۔ جب کبھی بھولے بھٹکے ہم ریسرچ روم پہونچتے تو دم بھر میں لائبریری ہمارے رونق افروز ہونے سے تفریح الاحباب کلب میں تبدیل ہو جاتی۔

یہ بات نہیں کہ اس دوران ہم تحقیق کے فرض سے یکسر غافل ہو گئے یا ہم میں بے دلی کے آثار پیدا ہو گئے، نہیں بلکہ ہم مصروف سے مصروف تر ہوتے چلے گئے۔ ریسرچ روم میں ہماری میز پر کتابوں کی تعداد اور گرد بڑھتی چلی گئی۔

ہماری بغل میں بندریا کے بچے کی طرح دبے رہنے والے پورٹ فولیو کا پیٹ اس طرح پھولتا جا رہا تھا کہ کبھی کبھی ہم کو بھی شبہ ہو جاتا کہ واقعی کسی دن اس میں سے تھیسس نہ تو در ہو جائے۔

ریسرچ کے بہانے کھائیں کہ جب ہم نے کئی سال گزار دیے تو ہمارے دوستوں، بزرگوں اور رشتے داروں نے اٹھتے بیٹھتے، ہمارا ناطقہ بند کرنا شروع کر دیا ہے صرف ایسے انکوائریز ہونے لگیں۔

"کہیے جناب! ریسرچ کس منزل پر ہے؟"

"کب جمع کر رہے ہیں؟"

"ٹائپ شروع کروا دی؟"

"اس کنووکیشن میں ڈگری مل جائے گی؟"

ہر چند کہ ہم نے آج تک باقاعدہ اپنی تحقیق کی ABC بھی نہ لکھی تھی۔ مگر ہمیشہ بڑے اعتماد کے ساتھ جواب دیتے۔

"بس اب ختم پر ہے!"
"جمع کرنے والے ہیں"
اور جو کوئی پوچھتا ۔
کس اسٹیج پر ہے ؟
تو کہتے ۔
"اسٹیج پر ہے"، اور پوچھنے والا ہنس کر خاموش ہو جاتا ۔
جب ہمارے نگراں صاحب پوچھتے تو ہم انھیں یہ بتا کر مطمئن کر دیتے نوٹس تو مکمل کر لیے ہیں بس اب لکھائی کا لگا لگا یا ہے ۔ وہ فرماتے ۔
"ارے بھئی ہم بھی تو دیکھیں کہ آخر آپ کیا لکھ رہے ہیں ؟"
تو ہم عرض کرتے ۔
"جی ہاں ! وہ بھی اب میں دو دو لین تین چیپٹر ایک ساتھ آپ کو دیکھنے کے لیے دینے والا ہوں دو تین قسطوں ہی میں کام مکمل ہو جائے گا ۔"
قسمت کی خرابی دیکھئے کہ ہمارے نگراں صاحب نے بلا ہمارا کام دیکھے ہماری رپورٹ پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا جس کا ایک فوری نتیجہ تو یہ ہوا کہ واقعی ہمارے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے، دوسرے ہم اسکالرشپ کی قسط نہ حاصل کر سکے ۔
جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو ہم نے مجبوراً پھر ڈاکٹر بندے علی خاں کی چوکھٹ پر سجدہ کیا ۔
انھوں نے نہایت اطمینان سے ہمارا مرثیہ سُنا اس کے بعد پوچھا

"تمہاری تھیسس کا عنوان کیا ہے؟"

عرض کیا۔

"ڈاکٹر صاحب عنوان ہے۔ اردو شاعری میں تال دُسر کی اہمیت"

وہ کچھ سوچتے ہوئے اندر گئے، اور تھوڑی دیر کے بعد ہم پر ہنستے ہوئے واپس آئے، ان کے ہاتھ میں ایک نہایت بوسیدہ جلد تھی۔ جو رسالہ "گیت کار" کی سال بھر کی فائل تھی۔ اور بولے

"دیکھو یہ رسالہ ۱۸۵۷ء میں غدر کے زمانے میں نکلتا تھا۔ اس کی اب دوسری جلد کہیں نہ ملے گی۔ قطعی نایاب ہے۔ اس میں استاد اللہ رکھے کا ایک مسلسل مقالہ "تال وسُر کی شعریت کی اہمیت" چھپا تھا۔ تم اسے ابواب میں تقسیم کر کے اپنی سنائیس کے مطابق صرف نقل کرتے جاؤ اور جہاں لفظ "شعریت" آئے وہاں شاعری لکھ دینا۔ بس پھر تم کو دنیا میں ڈاکٹر ہونے سے کوئی روک نہیں سکتا۔"

ہم نے رسالے کی جلد اپنے پورٹ فولیو میں رکھی اور گھر پہونچ کر کمرہ اندر سے بند کر لیا۔ ایک مہینے تک ہم انڈر گراؤنڈ رہے اور مہینہ بھر بعد جب ہم سع اپنی تھیسس کے برآمد ہوئے تو ڈاکٹر بندے علی نے نہایت ایمان داری سے رسالہ "گیت کار" کی جلد کو انہیں دکھا دی۔ ہم نے تھیسس ٹائپ کر کے داخل کی اور یونیورسٹی نے ہمیں ڈاکٹریٹ عطا کر کے نہ صرف گاؤن میں تصویر کھنچوانے کا موقع عطا کیا۔ بلکہ ہمارے نام کے آگے محض "ایم اے" کے ایم اے پی ایچ ڈی ہو گیا۔ بندے کی

کوشش اور ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ صاحب کی مہربانی سے کچھ ہی
دن میں "ڈاکٹر" کے ساتھ ہمارے نام کی تختی میں "پروفیسر" کا بھی اضافہ
ہوگیا۔ اور ڈاکٹر سید علی خاں پھر سے ہمارے لنگوٹیے یار ہو گئے۔
جن کے ساتھ ہم ٹھاٹھ سے یونی ورسٹی جاتے، اسٹاف کلب میں برج کھیلتے
اور پالیٹکس لڑاتے ہیں۔

مکان کی تلاش

ایک آدمی دریا میں ڈوبتے ہوئے چلا رہا تھا۔

"بچاؤ! بچاؤ!"

ایک شخص دوڑا اور اس سے پوچھا "

"تم کہاں رہتے ہو؟"

اس کا پتہ نوٹ کر کے بھاگا لیکن جب اس کے گھر پہونچا تو معلوم ہوا کہ ایک منٹ پہلے نیا کرایے دار آچکا ہے۔

آنے والے نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

"ہو نہ ہو! نیا کرایہ دار وہی شخص ہے جس نے مرحوم کو دریا میں ڈھکیلا تھا"

ہم نے یہ ٹریجڈی سننے کے بعد اپنا سر پیٹ لیا کہ کاش ہم نے مرحوم کو

دریا میں ڈھکیلا ہوتا تو اس وقت وہ سنتے کہ اسے دار ہم خود ہوتے یا
اس کے بعد ہم انسانی درخشان مکان کی تلاش میں نکل پڑے راستے میں ایک
جنازہ جارہا تھا ہم نے پوچھا۔
"یہ کس کا جنازہ ہے؟"
مرنے والے کا نام و پتہ نوٹ کرکے فوراً الاٹمنٹ کے دفتر پہونچے
اور درخواست دی۔
"فلاں شخص مرگیا ہے اس کا مکان ہمیں الاٹ کر دیا جائے"
تھوڑا بہت دے کے مکان اپنے نام الاٹ کرا لیا۔ اس کے بعد ہم
تقریباً دو درجن تعزیت کرنے والوں کو لے کر پہونچے اور روتے ہوئے پوچھا۔
"مرحوم کس کمرے میں رہتے تھے۔؟"
کمرہ دیکھنے کے بعد ہم نے کہا۔
"مرحوم سے مجھے اتنی محبت تھی کہ اب میں جیتے جی یہ جگہ نہیں چھوڑ سکتا!"
اور ہم نے وہاں آسن جما دیا۔ لیکن تعزیت کرنے والوں کے جانے کے بعد مرحوم
کے پس ماندگان نے ہماری ایک نہ سنی اور زبردستی نکال باہر کیا۔
مرحوم کے دولت خانے سے نکالے جانے کے بعد بھی ہم ہمت نہ ہارے
اور مکان حاصل کرنے کے لیے کچھ کرایے دار کی عورتیں رہیں انھیں سکھا
پڑھا کے چلتا کیا اور پیچھے پیچھے ہم خود چلے۔
یہ عورتیں بیٹھ پر سامان لادے گھر گھر جا کر پوچھتیں۔
"مکان کا کوئی حصہ کرایہ پر مل سکتا ہے؟"

"نہیں!"

"اچھا صحن یا کھلی چھت کا کوئی حصہ دے دیجیے ہم چھپر ڈال دیں گے"

"نہیں!"

اس کے بعد عورتیں سامان رکھ کر بیٹھ گئیں اور بولیں۔

"پانی پلا دیجیے!"

"پانی پینے کے بعد ستانے کے لیے ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گئیں۔ پھر مچل گئیں"

"ہم رات یہاں گزار لیں؟"

صبح جب ان سے مکان خالی کرنے کے لیے کہا گیا تو انھوں نے چلانا شروع کر دیا۔

"تم نے ہمیں آدھا مکان کرایے پر دیا ہے!"

ان کا شور سن کر باہر منتظر ہم لوگ اندر آ گئے اور وہ شور و غل مچا کہ پولیس آ گئی۔ زبردستی مہمان بنے رہنے کے شرف کو برقرار رکھنے کے لیے ہم نے عدالتی چارہ جوئی کی، عدالت نے حکم امتناعی جاری کر دیا۔ ایک طرف مقدمہ چلتا رہا اور دوسری طرف ہم مہمان لوگ میزبان کو پریشان کرتے رہے، یہاں تک عاجز آ گیا کہ مجبوراً مکان والے بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس سے پہلے کہ مکان پر ہمارا قبضہ ہو جاتا کسی نے مالک مکان کو گھر خالی کرتے دیکھ کر فوراً الاٹمنٹ کے دفتر کا رخ کیا اور مکان الاٹ کرا کے ہمیں نکال باہر کیا۔

کہتے ہیں ڈھونڈھنے سے خدا بھی مل جاتا ہے۔ ضرور مل جاتا ہوگا۔ لیکن لاکھوں کی تلاش کے بعد مکان نہیں مل سکتا۔ اسی چکر میں پیٹ کر کے نکلے کہ

مکان تلاش کر لیں گے ورنہ خود ہی لاپتہ ہو جائیں گے، لیکن ہوا یہ کہ نہ مکان مل سکا اور نہ خود ہی لاپتہ ہو سکے۔ لیکن ہر مکان کو خالی سمجھ کر اس میں گھسنے کے چکر میں کئی بار پولیس کے ہتھے چڑھتے چڑھتے ضرور بچے!

جب سارے شہر میں ایک بھی "ٹولٹ" کا بورڈ نہ ملا اور نہ کسی نے بتایا کہ کسی کا کوئی مکان کہیں خالی ہے تو ہم نے اخباروں اور رسالوں میں "ضرورت ہے مکان" کے اشتہار نکلوائے اور احباب کو دھمکی دی کہ اگر مکان نہ ملا تو مع سامان کے تمہارے یہاں دھرنا دے دیں گے لیکن اس طرح مکان اور اس کا پتہ تو نہ ملا البتہ دوستوں کی بھیڑ ضرور چھٹ گئی۔

جب ہم کسی خالی مکان میں تالا لگا دیکھتے تو اس خیال کے تحت اس کے چکر لگانے لگتے کہ یہ ضرور خالی ہوگا! جس سے پاس پڑوس والوں کو شک ہونے لگتا کہ کہیں ان کا ارادہ قفل شکنی کا تو نہیں۔؟

لیکن یہاں قفل شکنی تو کجا کسی کی دل شکنی بھی نہیں کر سکتے اور اسی مروت کے مارے آج مکان کی تلاش میں زمین کا گز بنے ہوئے ہیں۔

ہوا یہ کہ جس مکان میں ہم رہتے تھے اس کے مالک نے ہمیں بڑے سبز باغ دکھائے کہ "اگر ہم کچھ دن کے لیے کہیں اور چلے جائیں تو وہ اس ٹوٹے ہوئے مکان کو توڑ کر نئی بلڈنگ کھڑی کر دے گا۔ جس میں ہمیں بجلی اور پانی کے پائپ وغیرہ کی خاص سہولتیں بالکل مفت حاصل ہوں گی" ہم ان کی باتوں میں آ کر اپنے دوست خاں صاحب کے یہاں ڈیرا جما دیا۔ مالک مکان نے مکان بنوانے کے بجائے اسی کھنڈر کا پیشگی کرایہ اور پگڑی لے کر ایک نیا کرایہ دار بسا لیا۔

بس تبھی سے ہم مکان ڈھونڈتے اور خان صاحب سے آنکھیں چرائے پھرتے ہیں ۔

ہمارے ایک دوست جو مکان تلاش کرنے میں ہماری کافی مدد کر رہے تھے سخت بیمار پڑ گئے ۔ ہم نے بھی بہت جی لگا کر ان کی تیمارداری کی تاکہ وہ جلد از جلد اچھے ہو کر ہمارے لیے مکان ڈھونڈھ سکیں ، لیکن جوں جوں ان کا علاج کیا حالت بگڑتی گئی ، یہاں تک کہ آخر ان کا انتقال ہو گیا ۔ ہم نے اپنے دوست کا کفن دفن اور تیجہ چالیسواں اس خیال سے کر دیا کہ پگڑی اور پیشگی کرایہ نہیں دیا ، مرحوم کی آخری رسوم ادا کر دیں اور ہم مرحوم کے مکان میں منتقل ہو گئے ، لیکن ابھی ہم نے اچھی طرح سامان بھی نہ کیا تھا کہ پولس نے ہمیں نکال باہر کیا ۔ کیونکہ مرحوم کے پس ماندگان نے مکان اپنے نام الاٹ کرا لیا تھا ۔

اس بار خان صاحب نے بھی ہمیں پناہ نہ دی ، مجبوراً ہم نے سامان اسٹیشن کے لگیج روم میں جمع کر دیا اور پلیٹ فارم پر رات کو سونے کے ساتھ ساتھ دن کو مکان کی تلاش کا سلسلہ جاری رکھا ۔ اس تلاش کے باوجود کچھ دنوں میں گھر تو نہ ملا ، لیکن گھر والی ضرور مل گئی ، جس کی وجہ سے رات بسر کرنے کے لیے کرایے پر رات میں "رین بسیرے" میں جگہ مل جاتی ، لیکن مکان کے بارے میں ہماری مایوسی یہاں تک بڑھ گئی کہ ہم سوچنے لگے ، کیوں نہ ہم دونوں کوئی ایسا جرم کر ڈالیں کہ ہمیں جیل ہو جائے اور اسی طرح رہنے کا سہارا ہو جائے ۔

مکان نہ ملنے کی صورت میں ہم نے یہاں تک کوشش کی کہ مکان نہ سہی ایک کمرا یا کوٹھری ہی مل جائے لیکن گوڑ کے پھول کی طرح وہ بھی نہ ملی۔ ہم نے اپنے دوستوں اور رشتے داروں پر ہر طرح سے زور دیا لیکن کوئی بھی "ہاں ہوں" یا زبانی ہمدردی سے آگے نہ بڑھا۔ رفتہ رفتہ ہمارا یہ عالم ہو گیا کہ ہم محل اور کوٹھی بنگلے کا کیا ذکر، کسی غریب کی جھونپڑی، فٹ پاتھ یا سائے دار درخت دیکھ لیتے تو ہماری رال ٹپک پڑتی اور چلتے پھرتے، فٹ پاتھ پر چھپّر چھانے کے امکانات پر غور کرنے لگتے۔

جب کسی کا کوئی آسرا نہ رہا تو ہم خود مکان کی تلاش میں نکلے۔ ایک دن ایک مخبر نے سراغ دیا کہ فلاں محلے کی فلاں گلی میں فلاں مکان کا ایک حصہ کرایے کے لیے خالی ہے۔

مکان جا کر دیکھا، مکان تو کیا مکان کا نام تھا جس کی چھت آسمان اور دیواریں سرسبز تھیں۔ گھنٹوں آواز دینے پر ایک بڑے میاں اندر سے برآمد ہوئے بولے۔

مکان تو مل جائے گا لیکن اس شرط پر کہ پہلے اس کو بنوانا پڑے گا۔

ہم نے کہا۔

"ٹھیک ہے پہلے اس کا نقشہ بنوا کر منظور کروا لیں۔"

اس کے بعد ہم وہاں سے سر پر پیر رکھ کر بھاگ نکلے۔

ایک اور مکان کا پتہ لگا۔ اس میں سے ایک برخوردار برآمد ہوئے پوچھا

"کیا بیچتے ہو؟"

عرض کیا ۔

"مکان خریدنے نہیں کرایہ پر لینے آئے ہیں ۔"

یہ سن کر وہ اپنے بڑے بھائی کو بلا لائے ۔ ان کے بڑے بھائی نے ہماری تعلیم، مالی اور خاندانی حالت اور بیماری باکی اور عادتوں کے بارے میں سیکڑوں باتیں پوچھ ڈالیں ۔

اس کے بعد پوچھا ۔

"آپ بچوں کو پڑھا سکتے ہیں ؟"

عرض کیا ۔

اس سے پہلے کبھی نہیں پڑھایا !"

کھانا پکانا آتا ہے ؟"

یہی تو ایک شوق ہے ہمیں ۔ جب سے ہمارا باورچی کھا گیا ہے تب سے ہم نے باورچی رکھنا ہی چھوڑ دیا ۔

"شادی ہو گئی ہے ؟"

"جی ہاں !"

پھر خواہ مخواہ دیواریں کالی کرنے سے فائدہ ؟"

یہاں سے جو چلتے کیے گئے تو ایک اور مالک مکان کے پاس پہونچے ، انھوں نے اپنے ایک مقدمے کی پوری مثل ہمیں سنانے کے بعد ہم سے قانونی مشورہ لیا اس کے بعد بولے ۔

"باپ رے باپ ! ہم اتنے قانونی آدمی کو اپنا مکان نہیں دے سکتے ۔ معاف!

چلتے پھرتے نظر آئیے! چلتے پھرتے!!"

دوسری جگہ جب قسمت آزمائی کے لیے پہونچے تو انھوں نے ہمیں اپنی مکمل کلیات سنادی، ان کا کلام سنتے سنتے ہم بے ہوش ہوگیے، جب ہم ہوش میں آئے اور موقع غنیمت پاکر عرض مدعا کیا، تو بولے۔

"کسی نے آپ کو بہکا دیا۔ بھلا شاعر اور مکان؟ میں خود دن رات مشاعروں میں رہتا ہوں، مکان دکان میرے پاس کہاں؟"

ایک گلی میں ہم نے جاکر مکان کے سلسلے میں اتنی آوازیں (مکان ہے مکان؟) لگائیں کہ کسی دل جلے بہرے نے تنگ آکر اوپر سے ہمارے اوپر ایک بالٹی پانی پھینک دیا۔ اب جو ہم وہاں سے چوہا ہو کر بھاگے اور اوپر والوں نے چور!چور!! کا نعرہ بلند کیا تو آگے آگے ہم پیچھے پیچھے محلے کے لونڈوں اور گلی کے کتوں نے تالیاں بجا بجا کر اور بھونک بھونک کر ہمیں دوڑا لیا۔ پھر جو ہم بے تحاشا بھاگے تو ایک صاحب سے ٹکراتے ٹکراتے بچے۔ انھوں نے ......

"یادحشت؟"

کہہ کر ہمیں پکڑ لیا اور بولے۔

"خیریت؟"

عرض کیا۔

"مکان۔۔!"

"بھلی بتانا جانتے ہو؟"

"جانتے ہیں!"

اس کے بعد انھوں نے ہم سے فیوز وغیرہ بنوانے کے بعد کہا۔

"وہ سامنے والا کمرہ آپ کو مل سکتا ہے لیکن ہر ماہ پیشگی سو روپے دینا ہوں گے۔"

ہم نے کرائے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے جا کر کمرہ کا معائنہ کیا تو معلوم ہوا کہ محض ایک تنگ و تاریک کوٹھری ہے جس میں صرف پنجوں کے بل داخل ہوا جا سکتا ہے۔ ہم داخل ہوتے ہی مکڑی کے جالوں اور گرد و غبار میں اٹ گئے۔ نہ دروازہ نہ روشن دان، کچھ بھی نہ تھا۔ بولے۔

"آپ اس میں آجائیے ہم اپنی بکریاں کہیں اور باندھ دیا کریں گے" چلتے وقت انھوں نے پوچھا۔

"آپ کی شادی ہو گئی؟"

عرض کیا "نہیں!"

وہ گرجے "اگر شادی نہیں ہوئی ہے تو کوئی اور مکان دیکھئے۔ یہ گھر ہے کوئی سرائے نہیں۔"

پھر نکالے جانے کے بعد ایک اور رفیر رسیدہ بزرگ کے پاس پہونچے اور کہا "سنا ہے آپ کے یہاں مکان خالی ہے؟"

انھوں نے جگالی کرتے ہوئے پوچھا

"کھانے میں آپ کو کیا پسند ہے؟"

عرض کیا "جو مل جائے"

بولے "ہم لوگ کھاتے ہیں

"ہم بھی آج تک لو کی کھاتے آئے ہیں!"

"مجھے بیڑ اور مقدمہ لڑانے کا شوق ہے"

"اپنا بھی یہی شوق ہے!"

انھوں نے ہمیں گلے لگاتے ہوئے کہا۔

"بس ہم ایسا ہی آدمی چاہتے تھے جو ہمارے ساتھ رہے اور لو کی کھائے"

مکان ڈھونڈنے کے بارے میں ہماری اتنی معلومات ہیں کہ راہ چلتوں، دوستوں اور رشتے داروں کی چال ڈھال اور بات چیت سے اندازہ لگا لیتے ہیں، کہ یہ ایک مکان کی تلاش میں ہیں۔ اخباروں میں اس قسم کے اشتہار اور خبریں نظروں سے گزریں۔ مثلاً ایک خبر تھی۔

کیا واقعی آپ کو مکان کی بہت سخت ضرورت ہے؟۔ اگر آپ مکان کے بارے میں بہت سنجیدہ ہیں تو لگے ہاتھوں ایک مکان ہمارے لیے بھی تلاش کر ڈالیے مکان تلاش کرنے والے کی خدمت میں سفر خرچ پیش کیا جائے گا اور مکان دلا دینے والے کو اس کے ساتھ معقول نذرانہ بھی قبضہ ملتے ہی نقدی کی صورت میں ادا کر دیا جائے گا۔ معرفت پوسٹ بکس ۲۱۰ الف، خ۔"

پڑھنے کے بعد معلوم ہوا کہ جسے اب تک خبر سمجھ رہے تھے وہ محض ایک اشتہار تھا۔ ساتھ میں ایک اعلان بھی تھا۔

"مکان نیا ہو یا پرانا، بوسیدہ یا خستہ دلوانے والے کی تصویر ہم اپنے اخبار میں نمایاں طور پر شائع کریں گے"

خیر یہ تو ایڈیٹر صاحب کی تلاش مکان کا شاخسانہ تھا۔ ایک سرخی پر نظر پڑی

ٹینڈر مطلوب ہیں! سب سے شاندار اور سب سے کم کرایے کا مکان مع فرنیچر تلاش کرنے والے کو ترجیح دی جائے گی۔ ساتھ ہی مالک مکان کی تحریری منظوری آنا ضروری ہے" یا... انسان ہمیشہ سے مکان میں رہتا آیا ہے؟

دلیل معقول، لیکن کسی ہوٹل والے نے پیش کی تھی جسے سب سے زیادہ کرایہ دینے والے مسافروں کی ضرورت تھی اور نقد پر اصرار تھا۔

ایک صاحب جنھیں مکان مل گیا تھا۔ انھوں نے اخبار کے ذریعے مکان تلاش کرنے والوں کا شکریہ ادا کیا تھا اور معذرت یہ کی تھی کہ فرداً فرداً سب کا شکریہ ادا نہیں کر سکتے، کیونکہ عملاً یہ ان کے لیے ممکن نہیں۔

ایک نوکری کا اشتہار بھلائے نہیں بھولتا۔

"ان حضرات کو ترجیح دی جائے گی جو دفتر کے لیے ایک معقول عمارت تلاش کر سکیں۔ عملے کے کوارٹر تلاش کرنے والوں کی ملازمت مستقل کر دی جائے گی۔"

! پھر وہ وصیت کہ باپ نے بیٹے سے وصیت کی "بیٹا! ہر حالت میں مکان کی تلاش جاری رکھی جائے"۔ واضح ہو کہ یہی وصیت اس کے دادا نے مرتے وقت اس کے باپ سے کی تھی۔

اس قسم کی کتابیں تو اکثر آپ کی نظر سے بھی گزری ہوں گی۔ "مکان تلاش کرنے کا سلیقہ"، "مکان ڈھونڈنے کا فن"، "سوچنا چھوڑیے اور مکان تلاش کرنا شروع کیجیے"، "... میں نے مکان کیسے حاصل کیا؟"

ایک البم یاد آ گیا۔ اس میں کسی مادر زاد لیڈر کی فل سائز تصویر تھی۔ اس نے اپنی پارٹی کو دھمکی دی تھی کہ "اگر پندرہ دن کے اندر پارٹی نے میرے لیے مکان

نہ تلاش کیا تو میں مخالف پارٹی میں جا ملوں گا "۔ اگلی تصویر پر ایک جاسوس بکی تھی جس نے مکان تلاش کر کے ایک ہلچل مچا دی تھی وہ تصویر میں مکان دیکھ کر اس طرح مسکرا رہا تھا جیسے زمین دیکھ کر کولمبس پہلی بار مسکرایا تھا۔

اکثر احباب جو بڑے مزے کے بے فکرے تھے اور جن کے ساتھ گپ شپ میں بآسانی وقت کٹ جاتا تھا، اچانک غائب ہو گئے اور اتنا زمانہ گزر گیا کہ ہم انہیں بھول گئے لیکن پھر اچانک ایک طویل مدت کے بعد مکان سمیت برآمد ہوئے۔

ایک شادی میں گئے دعوت کے بعد دولہا کو جا کر مبارکباد دی۔ دولہا نے سہرے میں سے چاند سا مکھڑا نکال کر مسکراتے ہوئے کہا۔

ہاں صاحب! یہ مکان ملتا، نہ ہم سب کو جمع ہونے کا موقع ملتا۔

گویا یہ سب کچھ شادی نہیں، مکان ملنے کا ہنگامہ تھا جس کا سہرا ان کے سر باندھا گیا تھا۔

ایک تشدد پسند گروہ سے بغرض ہونے تشریف لے گئی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ کسی صاحب کے پاس ایک بیٹھک کوٹھری نکل آئی تھی۔ انھوں نے مدتی میں دوستوں کے خیال سے اسے کرایہ پر اٹھانے کا اشتہار دیا تھا جس کے نتیجے میں ان کے پاس بہت سی درخواستیں آ گئیں۔ وہ غریب پھلے آدمیوں کا انٹرویو لیتے جاتے اور سوچتے جاتے کہ، کس کس سے جھوٹ بولیں اور کس کس سے تعلقات خراب کریں۔

اکثر دوست "ہائی ڈے ہو ڈے" میں نظر آتے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ آج کل مکان تلاش کر رہے ہیں، جب تک مکان سے چھٹی نہ مل جائے دفتر سے چھٹی رہے گی۔

مکان تلاش کرنے کے سلسلے میں خود ہماری حالت سب سے پتلی تھی اس لیے

چیل ٹاک، کے دوران ہمیشہ گھما پھرا کر گفت گو کا رخ اس پہلو کی جانب لا کر نہایت گمبھیر آواز ہیں کہتے۔

"صاحب مکان تو بہت ہی سیریس پرابلم بنتا جا رہا ہے!"

اور لوگ "ہاں صاحب، ہاں صاحب! کہہ کر اس پر روشنی ڈالنے لگے۔ لوگ پوچھتے تھے کہ بھئی کیا کر رہے ہیں؟"

ہم کہتے۔ "مکان تلاش کر رہے ہیں"

اس مکان تلاش کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ پیسہ جو اب تک ہم اپنے گھر والوں کے علاج معالجے میں حکیم ڈاکٹروں پر صرف کرتے تھے، اب بڑی فیاضی کے ساتھ مکان تلاش کرنے والوں پر خرچ کر رہے ہیں، دلال مکان کا وعدہ اتنے زور شور سے کرتے کہ ہم ان سے کہہ کر شرمندہ ہوتے، ان کے خلوص کے آگے ہمارا سر جھک جاتا۔ بار بار اپنے محسنوں کو ٹوکتے خود اچھا نہ لگتا۔ بلکہ اکثر کو تو ٹوکنے سے پہلے ہی اپنے غم میں برابر کا شریک پایا لیکن ایسے لوگوں کا ساتھ رکھنا خطرہ سے خالی نہ تھا اگر کہیں مکان ملتا بھی تو بیچ سے اچک نہ لے جائیں تعلقات تو تھوڑے سے نشیب و فراز کے بعد سب ہی سے استوار ہو جاتے ہیں، لیکن نادر موقع زندگی میں بار بار نہیں آتا۔

اکثر ایسے مکان بالکل بس ملتے ملتے رہ گئے جس کے بارے میں کبھی پتہ نہ لگ سکا کہ اس میں مکانیت کیا ہے۔ یہ کہاں سے شروع ہوتا ہے اور کہاں ختم ہوتا ہے ایسے مکانوں میں تلاش کے باوجود ہمیں زمین و آسمان کے علاوہ کچھ نظر نہ آیا۔

ہمارے ایک بے تکلف دوست ایک دن راستے میں ہم سے کترا کر نکلنے لگے

انھیں یوں کچھ لے جاتے دیکھ کر شک ہوا۔ ہو نہ ہو ضرور ہم سے چھپا کر مٹھائی لیے جا رہے ہیں اور ہم سے بچ کر جانا چاہتے ہیں۔ جب دوستی کے درمیان سے بے تکلفی کا پردہ اٹھ جائے تو جیب میں ہاتھ ڈال دینا عین محبت سمجھی جاتی ہے لیکن انھوں نے ہمارے اصرار کے باوجود جیب میں ہاتھ نہ ڈالنے دیا۔ ہم نے کہا۔

"ہم بھی کھائیں گے!"

کہنے لگے۔ "کھانے کی نہیں ہے"

پوچھا "سونگھنے ہی سہی! لیکن ہم اس وقت بلا سونگھے ہرگز نہ جائیں گے"

بولے "پریشان نہ کرو"

اتنے میں ہمارا ہاتھ ان کی جیب کی گہرائیوں میں پہونچ کر کسی سخت چیز سے ٹکرایا۔ ہم نے کہا۔

"یہ اکیلے اکیلے اڑانے کے لیے حلوا سوہن لیے جا رہے ہو؟"

بولے "نہیں مانتے۔ اچھا تمھاری ضد ہی سہی! یہ کہہ کر انھوں نے شرماتے ہوئے جیب سے وہ شے نکالی۔ ہمارے منھ سے بے ساختہ نکلا۔

"ارے یہ تو اینٹ ہے! بھلا اس کا کیا کروگے؟"

انھوں نے فخر سے سر بلند کر کے کہا "جب مکان نہ ملا تو اب مکان بنوانے کا ارادہ ہے۔ اس لیے ابھی سے میٹریل جمع کرنا شروع کر دیا ہے"

مکان کا تذکرہ انھوں نے کچھ اس انداز سے کیا جیسے ان کے گھر میں خوشی کے آثار ہوں، معصومیت ان کے چہرے پر کھیل رہی تھی

بس وہ دن ہے اور آج کا دن! قسم لے لیجیے جو ہم نے کبھی مکان تلاش کرنے کا نام بھی لیا ہو۔

تختیاں

دراصل ہماری زندگیاں خود چھوٹی موٹی چلتی پھرتی تختیاں ہیں۔ جن پر نظر ڈالتے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ہم حلوائی ہیں، خاکروب ہیں کہ وکیل ہیں یا شاہ صاحب، میر صاحب، ٹھاکر صاحب، خاں صاحب اور نواب صاحب وغیرہ میں سے کچھ نہ کچھ ضرور ہیں تاڑنے والے (جو قیامت کی نظر رکھتے ہیں) ان تختیوں پر ایک نظر ڈالتے ہی، صاحبِ تختی کے اعمال، حرکات، سکنات، رفتار، کردار اور دوسری غیر ضروری تفصیلات فوراً تاڑ لیتے ہیں۔

علاوہ ازیں ہوٹلوں، گھروں، بنگلوں، کوٹھیوں اور دکانوں پر لگی ہوئی تختیاں دراصل ان چلتی پھرتی تختیوں پر محض اضافہ ہیں۔ ورنہ ضمیمہ۔ ایک زمانے میں ہم نے بھی، جب ہم محض ایف اے کے طالب علم تھے۔ تو آئی، سی ایس (انٹر کلاس اسٹوڈنٹ) کی تختی کچھ اس انداز سے لگائی تھی کہ ہمارے

نام کے نیچے بطور حفظ مراتب آئی سی، ایس۔ بالکل صاف پڑھ لیا جائے۔ جس سے سوائے اس کے اور کچھ نہ ہو سکا، کہ ہم پھر ایف، اے، میں فیل ہو گئے۔ لہٰذا احتیاطاً ہم نے اگلے سال اپنے نام کے نیچے آئی اے، ایس لکھوا دیا (ٹر آرٹس اسٹوڈنٹ) جو ہماری اگلی سال گرہ کے موقعہ پر نوچ کر پھینک دی گئی

یوں تو ہمیشہ سے ہماری عادت ہے کہ راہ چلتے جتنے سائن بورڈ نظر پڑیں ان کو احتیاطاً ایک بار اور پڑھ لیتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہمیں اپنے شہر کا نصف سے زائد جغرافیہ تقریباً زبانی یاد ہے۔ بلکہ یوں سمجھیئے کہ اسی کی برکت سے ہم اپنے شہر کا منھ زبانی چلتا پھرتا "گائیڈ" ہیں یہ ہم آپ کو بآسانی بتا سکتے ہیں کہ جہاں پر کلچرل سنٹرل کی تختی لگی ہوئی ہے دراصل وہاں پر زندہ عجائب گھر واقع ہے، اور جہاں سول کورٹ اور ہیلتھ ڈپارٹمنٹ کی تختی آویزاں ہے وہاں پر میوزیم ہے۔ اور جس جگہ میوزک کالج کا پتھر نصب ہے دراصل وہ پتھر گھر ہے اور اسی میں گونگے بہروں کا اسکول بھی ہو۔ جس مقام پر "محکمہ تحفظ مولیشیان" کندہ ہے۔ وہیں سے یونیورسٹی شروع ہو جاتی ہے۔ جہاں پر روزانہ "گریٹ انڈین سرکس" کے شو ہوتے ہیں۔ اسی میدان میں اسمبلی ہاؤس ہے۔

اگر بازار میں لگی ہوئی تختیوں کو آپ غور سے پڑھیں تو بڑے دلچسپ انکشافات عمل میں آئیں۔ مثلاً جہاں بڑے جلی حروف میں "لائی کاز" لکھا ہوا ہو دراصل محض وہ ایک جلد سازی کی فرم ہو جس کا شریا تین سنگھ سے کوئی تعلق نہیں جہاں بڑے حروف میں بنارسی رام اینڈ سنز لکھا ہو وہ بنارسی پان والے کے لڑکے کی بی چیٹیچر سی پان کی دکان ہو اور جہاں راکٹ لکھا ہوا ہے وہ صرف ڈرائی کلین کہتے ہیں۔

"سندھ بادی ٹیلر" اور بتن حجام کے ناموں کی تختیاں ضرور آپ کو چونکا دیں گی "اصلی مکھن چور گھی" شاید آپ کو سوچنے پر مجبور کر دے کہ "گھی" تو ایک چیز ہوئی روزمرہ کے استعمال کی۔ مگر یہ اصلی اور خالص "گھی" کیا ہوا؟ "مکھن چور" پڑھتے ہی ایک حد تک صاحبِ معاملہ کی نیت کے بارے میں علم ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی "گرہ بڑھبالا" گدڑی، نخاس، چوک، جیسے بازار جو دن رات کھلے عام راہ گیروں کو دعوت دیتے رہتے ہیں کہ آؤ اور آکر چوری کے کھاؤ خرید و فروخت کر جاؤ۔ خرید کم اور فروخت زیادہ۔

یوں تو ان تختیوں کی ایسی بھرمار ہے کہ اکثر ایسا محسوس ہوتا ہے۔ کہ اگر واقعی یہ نہ لگی ہوں تو ہم دن رات بھٹکا ہی کریں۔ بجائے اس کے کہ جو چیز خریدنا ہوئی اس کی تختی پڑھی اور وہاں سے چیز خرید لی، ہر ہر دکان پر ان تختیوں کی عدم موجودگی میں پوچھتے پھر رہے ہیں، پوچھا کپڑے کے بارے میں اور وہ بات کر رہا ہے۔ دھلائی یا سلائی کی، ہم اناج خریدنے کے موڈ میں ہیں اور دکاندار ہم کو جائے پر ٹال رہا ہے، بھلا دکان پر آئے ہوئے گاہک کو یوں ہی کیسے لوٹایا جا سکتا ہے، چنانچہ نتیجے کے طور پر ہم خریدنے کچھ نکلیں گے، لے کر پہونچیں گے کچھ اور، سکے کا استعمال سرے سے اٹھ جائے گا، نئے سرے سے اشیاء کا تبادلہ ہونے لگا اور عہد حال سے ہم پتھر کے زمانے میں واپس لوٹ جائیں گے۔ جہاں اگر ہمارے پاس جوتا ہو اور ضرورت ہم کو گیہوں کی ہو اور گیہوں والے کو کپڑے کی ضرورت لاحق ہو تو ہمیں ایک ایسا کپڑے والا تلاش کرنا ہو گا۔ جس کو واقعی فکر پاپوش

لاحق ہو اور ساتھ ہی وہ ہم کو فکرِ گندم سے بھی آزاد کر سکے۔ اور اگر وہ اس میں ناکام ہو تو جمع بھی ہوں اور ہاتھ میں ہمارے جوتا ہو۔

ان تختیوں میں سب سے دل چسپ ہوٹلوں اور چائے خانوں میں لگی ہوئی تختیاں ہوا کرتی ہیں، مثلاً ایک ہوٹل پر تختی لگی ہوئی تھی۔ "چائے کی پیالیوں میں سگرٹ کا گل جھاڑنے والوں کو چائے ایش ٹرے میں پیش کی جائے گی"؟ غالباً اسی سبب میزوں پر ایش ٹرے سرے سے ندارد تھے، ایسے ہی ایک رسٹوران میں لکھا تھا "براہ کرم ہوٹل کے بیروں سے مت لڑیے، ہمیں گاہک تو اور بھی مل جائیں گے، مگر ہم اور بیرے کہاں سے لائیں گے؟" مالک ہوٹل صاحب اتفاق سے خود اس وقت مستعدی سے بیرے کو پیٹ رہے تھے۔ ایک اوپن ایئر ہوٹل میں لکھا ہوا تھا۔ "برائے مہربانی بغیر بل ادا کیے یہاں سے کھسکنے کی کوشش نہ کریں ورنہ بعد میں بڑی شرمندگی اٹھانی پڑے گی"۔

ایک خاص بات ان ہوٹلوں میں یہ ہوتی ہے کہ جس چیز کی پرچہ ترکیب استعمال میں پرہیز کی ہدایت کی گئی ہو، سمجھ جائیے کہ وہاں کچھ اور ہو یا نہ ہو مگر وہ سلسلہ ضرور ہوگا۔ جس طرح داستانوں کے ہیرو کو ہدایت کی جاتی تھی کہ تین راستوں پر جانا مگر چوتھے پر نہ جانا۔ چنانچہ شہزادہ چوتھے راستے پر روانہ ہوتا تھا۔ مثلاً جس ہوٹل میں ہمیشہ ہمارا اکاؤنٹ چلتا ہے اور جہاں ہمارے تمام دوستوں کو بآسانی اُدھار مل جاتا ہے۔ وہاں جگہ جگہ تختیاں آویزاں ہیں۔ "آج نقد کل اُدھار"۔۔۔ "دام نقد۔۔۔"

قرض محبت کی قینچی ہے ، ، قرض دینے کا ہمارے یہاں دستور نہیں " ایسے ہی جس چائے خانے پر صاف صاف لکھا ہوا ہے ۔ " یہاں پر ریس کی باتیں کرنا منع ہیں " دراصل وہ شہر بھر کے ریسروں کا سب سے بڑا اڈہ ہے اور جہاں " یہاں پر مذہبی اور سیاسی گفتگو کرنا منع ہے " لکھا ہوا ہے " وہ تمام مقامی لیڈروں کا واحد مرکز ہے اور مولانا لوگ مرغ پلاؤ کھانے وہیں آتے ہیں اور جہاں پر لکھا ہوا ہے کہ " یہاں پر شراب پینا منع ہے " اس کے مالک ہوٹل صاحب خودکشی بار کچی کشید کے سلسلے میں سرکاری مہمان رہنے کا شرف حاصل کر چکے ہیں ۔

اگر ہوٹل سے نکل کر آپ کسی دفتر میں چلے جائیں ، تو آپ کو احساس ہوگا کہ فائیلوں کے انبار اور کلرکوں کے طومار کے بعد اگر کوئی شئے دستیاب ہوسکتی ہے تو وہ اس دفتر کی مختلف تختیاں ہیں جو احاطۂ دفتر کے طول و ارض پر حاوی ہیں ، اگر کوئی تختی اس امر کی جانب اشارہ کر رہی ہے کہ صاحب " اندر " ہیں تو یقین جانئے کہ میں اسکے برابر ہوں گے ، خواہ گھر میں کیوں نہ بیٹھے ہوں ۔ آدرنی ، اے بل میں ضروری اضافے کر رہے ہوں ، اور اگر صاحب اپنی میز پر موجود ہوں تو آپ دور ہی سے " باہر " دیکھ کر لوٹ جائیں گے یوں اس کی مشق ان چپراسی صاحبان کو بھی بخوبی ہوتی ہے ۔ جن کا تذکرہ ہماری اردو شاعری میں ، " دربان " اور " پاسبان " کے سلسلے میں برابر مراثی کی صورت میں قلم بند ہوتا چلا آرہا ہے ۔ ان میں سے زیادہ تر تختیوں سے بآسانی آپ پر واضح ہو جائیگا

کہ ان کو لگاتے وقت یہ بات قطعی ذہن میں رکھی گئی تھی کہ ان سے کبھی پڑھنے کا بھی کام لیا جا سکے گا۔ اول تو زیادہ تر تختیاں جناتی زبان میں ہوں گی ورنہ ایسے ثقیل الفاظ کے آپکی ساری زبان دانی دھری رہ جائے اور لغت بھی جواب دیدے۔ ورنہ ایسی سہل ممتنع میں ملیں گی۔ مثلاً جہاں پر لکھا ہوا ہے ”رشوت لینا اور دینا دونوں جرم ہیں“ وہیں ایک رشوت خور سے اینٹی کرپشن کے ایک افسر صاحب رشوت لیتے دیکھے گئے، پکڑے گئے!“ یوں نہیں کہا جا سکتا کہ بھائی ان کو کون پکڑے۔ یہ خود پکڑے ہی گئے تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ گئے تھے روزے بخشوانے الٹی نماز یا گلے پڑ گئیں۔ بیچاروں نے سوچا ہوگا۔ جب واجب ہیں تو پھر لاؤ ادا ہی کرتے چلیں۔ حساب صاف اچھا ہوتا ہے۔

یہاں سے گھومتے گھماتے اگر آپ پارکوں میں نکل جائیں تو دیکھیں گے کہ جہاں پر لکھا ہوتا ہے ”پھول توڑنا منع ہے“ عموماً وہیں پر پبلک پھول توڑنے میں زیادہ آسانی محسوس کرتی ہے، اور جہاں پر لکھا ہوتا ہے ”نو پارکنگ“ ٹھیک اسی کی سیدھ میں آرپار باقاعدہ چہل قدمی کے نتیجے میں ایک پگ ڈنڈی سی بن جاتی ہے۔ جس کا سلسلہ ہمیشہ نان کوآپریشن ”تحریک“ سے ملایا جاتا ہے اور جلد ہی قومی اہمیت کا مرکز بن جاتی ہے۔

گھروں کو واپس جائیے تو آپ کو عجیب و غریب قسم کی تختیاں ملیں گی۔ جن میں عموماً نام نہایت مختصر اور مخفی ہوا کرتا۔ اور انکساری

کا اظہار کرتا ہے۔ مگر عہدے یا قابلیت کا بیان خاص طور پر بڑے جلی حروف میں زور شور سے کیا جاتا ہے، جس سے صاحب خانہ کی انا کو بڑی تقویت پہونچتی ہے اور پڑوسی حضرات کو رشک کرنے کا موقع ہاتھ آجاتا ہے۔ اکثر گھرانوں میں باہر تختیوں کی بھرمار سے دور ہی سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ یا تو اس بیسویں صدی میں ابھی تک اُن کے یہاں جوائنٹ فیملی سسٹم رائج ہے۔ ورنہ ضرور انھوں نے یہ گھر نہ صرف کرایے پر اٹھا رکھا ہے۔ بلکہ مختلف خاندان بھر لئے ہیں۔

ان کلاسیکل قسم کے گھروں میں ڈرائنگ روم کی جگہ دُکانیں ہوا کرتی ہیں، جن کو دور ہی سے دیکھ کر اچھا خاصہ بھلا آدمی بھی سہم جائے کہ یہ تو گھر تک بکوا دیتے ہیں، یا پھر دکان پر تختی تو پریس کی لگی ہوئی ہے، مگر بک رہی ہیں چارپائیاں۔ سامنے ایک پان فروش صاحب براجمان ہیں، بغل میں نائی صاحب استراتیز کر رہے ہیں۔ دوسری جانب کلنڈر اور فلمی گانوں کی کتابیں فروخت کی جارہی ہیں جن کو دیکھ کر یقین ہوجاتا ہے کہ خدا سب کو دیتا ہے۔ مگر اکثر دکانوں پر تو آپ پتہ بھی نہیں لگا سکتے کہ کیا لکھا ہے، اور یقین ہوجاتا ہے کہ ضرور یہ اپنا کام پوسٹ بکس نمبر سے چلا رہے ہیں، اور اگر بورڈ بہت نمایاں ہے تو پھر دوکان میں دنیا بھر کی چیزیں مل جائیں گی۔ مگر وہ شے نہ دستیاب ہوگی، جس کے بارے میں ارشاد کرچکے ہیں، اگر ایسا ہوجائے تو پھر تختی لگانا بے کار اور محنت اکارت۔

آخر میں ایک اور تختی یاد آگئی جو اگر گھروں پر لگی ہو جس میں نمبر کا اندراج ہوا کرتا ہے تو اس نمبر پر کبھی خط یا آدمی نہ پہونچ سکے۔ اور اگر کوچۂ و بازار میں نصب ہے تو وہ تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ اہل شہر کا دلچسپ مشغلہ سڑکوں کے نام تبدیل کرنا بھی ہے یہ باریک تختے عموماً فرقہ وارانہ کشیدگی دور کرنے میں معاون ہونے کے سبب قومی اتحاد میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔

نوٹ:۔ اگر آپ اس مضمون کو کسی سائن بورڈ کمپنی کا اشتہار سمجھ کر پڑھ گئے تو ہمیں آپ سے خاصی ہمدردی ہے۔

سگرٹ پینا

ہمیں یاد نہیں کہ پہلے ہم نے ہوش سنبھالا یا سگرٹ پینا شروع کیا، لیکن جب ہوش میں آئے تو سگرٹ پی رہے تھے۔

پہلا سگرٹ وہ تھا جو ہم نے بھائی صاحب کے سگرٹ کیس سے پار کیا تھا اور انڈر گراؤنڈ "اسموکنگ" کے لیے "لیٹرن" جیسے محفوظ اور پُرفضا مقام کا ہم نے انتخاب کیا تھا۔ یہ واقعہ آتش کی جوانی سے قبل کا ہے۔ جب ہم تیسرے درجے میں داخل کیے جانے کے لیے گھر پر تیار کیے جارہے تھے اور کنگ ریڈر کی رٹائی کے ساتھ ساتھ سلیٹ پر باقاعدہ جمع تفریق اور ضرب تقسیم کے اس قسم کے سوال کرنے میں زچ ہوجاتے جن میں ۳ اونٹوں میں سے اگر دو خرگوش نکال لیے جائیں تو کتنے ہاتھی بچیں گے؟ نتیجہ کے طور پر کبھی جواب زیادہ نکلتا اور کبھی جانور کم ہوجاتے۔ اس زمانے میں ہم خاکی نیکر پہنتے تھے۔ جس کی ایک جیب میں ہم نے بھائی صاحب

کی پار کی ہوئی سگرٹ رکھی اور دوسری جیب میں باورچی خانے سے غائب کی ہوئی ماچس اور رہا تھ میں لوٹا تھا۔

بیت الخلا میں داخل ہونے کے بعد ہم نے اندر سے کنڈی لگا کر بجلی جلائی اور اکڑوں پوز بنا کر بیٹھنے کے بعد نہایت اطمینان سے سگرٹ سلگائی ابھی ہم پہلا کش لگا کر دھوئیں کے پھندے کے ساتھ کھانس ہی رہے تھے کہ کسی نے باب حاجت پر دستک دی۔ جواب میں ہم نے کھانسی کو بریک لگا کر "ہونہہ" کر کے زور سے کھنکھار دیا اور پھر زیر زمین ایٹمی تجربے میں مصروف ہو گئے۔

ہم بھائی صاحب کے دوستوں کو ناک سے سگرٹ کا دھواں نکالتے اور سگرٹ کے دھوئیں کے حلقے بناتے بڑے رشک سے دیکھا کرتے تھے۔ آج جو سنہری موقع ہاتھ آیا تو ہم نے بھی ناک آنکھ اور کان اور منھ سے دھواں نکالنے اور دھوئیں کے مرغولے فضا میں لہرانے کی باقاعدہ کوشش کی اور یہ بھی چاہا کہ دھواں پی جائیں خیر منھ سے تو دھواں کئی بار فو فو کر کے گال پھلا کے اور اپنے ہونٹوں کو مخروطی شکل میں لا کے سور کی تھوتھنی بنا کے اس کے گوشوں سے نہایت کامیابی کے ساتھ نکال لیا۔ لیکن ہمارے جیسے اناڑی نے جب دھواں پینے کی کوشش کی تو دھوئیں نے پہلے تو گلا پکڑا، اس کے بعد دھوئیں کا پھندا لگا تو کھانسی کے ساتھ ساتھ ہم اس طرح حرکت کرنے لگے گویا قدمچے پر نہیں اونٹ پر بیٹھے ہوں۔ ہماری آنکھوں سے آنسو اور ناک و منھ سے کف جاری ہو گیا۔ اسی کے ساتھ آواز آئی۔

"کیا سو گئے؟"

"اوفوہ بڑی زور سے لگ رہا ہے"

"جلدی نکلو"۔

مگر یہاں ابھی آدھی سگرٹ باقی تھی اس لیے نکلنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ لہٰذا زور سے کھنکھار کر پھر ایک بالکل ہی نئے اسٹائل سے سگرٹ کا ایک کش لیا اور ناک سے دھواں نکال ہی تو لیا۔ دھواں تو نکل گیا مگر ناک غریب دھوئیں کی تاب نہ لاسکی اور چھینک دی، ہم آنکھوں سے دھواں نکالنے کے لیے منھ میں دھواں بھرے آنکھوں پر زور لگا رہے تھے کہ اتنے میں چچا جان کی گرجدار آواز جو ہمارے کانوں سے ٹکرائی تو سگرٹ ہمارے ہاتھ سے چھوٹ کر ٹھڈی میں جا گری اور خوف سے منھ کھلنے کے سبب منھ سے دھواں نکل گیا۔ گھبراہٹ میں ہم نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ ایک چھپاکے کے ساتھ چچا جان اندر داخل ہوئے اور ہم باہر نکل کر نو دو گیارہ ہو گئے۔

تھوڑی دیر کے بعد چچا جان برآمد ہوئے انھوں نے چچی جان سے کچھ کہا۔ چچی جان نے سر پیٹ لیا۔ اور والدہ صاحبہ کے کان میں کچھ کہا۔ والدہ نے والد صاحب کو بتایا۔ ان کے ہاتھ سے چائے کی پیالی چھوٹ گئی اور انھوں نے بھائی صاحب سے جلدی جلدی کچھ بتایا۔ بھائی صاحب نے ہمیں آواز دی، ہم جیسے ہی بالکل انجان بنے ہوئے آئے، چچا جان نے ہمارا منھ سونگھنے کے بعد لپک کر ہمارا کان اس طرح پکڑ لیا گویا کان نہ ہوا ڈاکنگ اسٹک یا بیساکھی ہو گیا۔ وہ ہمیں لے کر لیٹرن کی طرف چلے، ان کے پیچھے پورا خاندان چلنے لگا۔ چچا جان نے باری باری سب کو ٹھڈی کا معائنہ کرایا۔ جہاں سگرٹ کا ٹکڑا پڑا تھا اور جس میں سے دھواں نکل رہا تھا۔ پاخانہ میں دھواں بھرا ہوا تھا۔ چچا جان نے کہا۔

"یہ کم بخت ضرور خاندان کا نام ڈبوئے گا۔"

اس کے بعد انھوں نے بتایا کہ۔ یہاں یہ صرف سگرٹ پینے آیا تھا۔ لوٹے کا پانی اس نے استعمال نہیں کیا۔

اس کے بعد ہمارا ناشتہ بند کر دیا گیا اور ہماری نقل و حرکت پر پابندی لگا دی گئی۔ ہمارے دو ایک ملاقاتی ہمارے پاس آنے کی پاداش میں پٹتے پٹتے بچے، اور ہمیں بہت سے اصلاحی لکچر گھول کر پلا دیئے گئے۔

رفتہ رفتہ حالات اعتدال پر آ گئے اور گھر والے اس واقعے کو محض اتفاقی حرکت سمجھ کر بھول گئے تھے، پھر ہماری شامت جو آئی تو ایک دن ہم نے سوچا کہ آج سے بہتر سگرٹ نوشی کا موقع پھر شاید زندگی میں نہ ملے۔ ہمارے پاس عیدی خاصی تھی، گھر والے شاہ مینا صاحب کے عرس میں شرکت کے لیے جا رہے تھے جہاں سے واپسی رات گئے ہوگی۔ اس درمیان ہمیں چھ گھنٹے مل رہے تھے لہٰذا ہم نے نہ جانے کا بہانہ کرتے ہوئے کہا۔

"ملازم نیا ہے صورت سے چور معلوم ہوتا ہے اس لیے آپ لوگ جائیے ہم گھر میں رہیں گے"۔

بات معقول تھی لہٰذا سب ہم پر گھر چھوڑ کر چلے گئے، پھر ہم گھر سے نکلے، آٹھ آنے کا تھری اے سگرٹ کا ٹن خریدا، ایک پیسے کی ٹکا ماچس لی۔ گھر آ کے ہم نے سگرٹ نوشی کے لیے ڈرائنگ روم کا انتخاب کیا۔ آرام کرسی پر اس شان سے لیٹ گیے جیسے چچا جان لیٹا کرتے تھے۔ دونوں ہتھوں پر ہم نے پیر پھیلا دیے اور اسٹینڈ پر سگرٹ کا ڈبہ رکھ کر اس کے اوپر ماچس رکھ دی، تھوڑی دیر تک ہم

فخر سے سگرٹ کے ڈبے اور ماچس کو دیکھتے رہے، ہم نے ایک فلم میں کسی ہیرو کو اس اسٹائل سے آرام کرسی پر دراز دیکھا تھا، مگر وہ آنکھیں بند کیے مسکرا رہا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ سگرٹ کے ٹن پر تھا اور دوسرا آرام کرسی کی پشت پر، لہذا دو منٹ تک ہم بھی یونہی بنائے دنیا کے مزے لوٹتے رہے، اس کے بعد ہم نے سگرٹ کے ٹن کا کڑکھڑا کر ٹن کاٹا۔ اس میں سے سگرٹ نکالی اور اس کے بعد پینے کے لیے دو تین سگرٹیں ڈبے کے ذرا اوپر اٹھا دیں اور سگرٹ سلگا کر بڑے فلسفیانہ انداز سے بالکل چچا جان کی طرح کش پہ کش لگاتے رہے، اس کے بعد ہم نے دھوئیں کے حلقے بنانے کی برابر ناکام کوشش کی، اگر ہم نے "بادشاہ اور مکڑی" والی کہانی نہ پڑھی ہوتی تو واقعی ہمت ہار چکے ہوتے، لہذا بڑی مستقل مزاجی کے ساتھ دور دور تک دھواں پھینکتے رہے۔ ایک دفعہ جو ہم نے آہستہ آہستہ منھ سے دھواں نکالا تو واقعی دھوئیں کے حلقے بنتے چلے گئے۔ اپنی تازہ ترین کامیابی پر مسکراتے ہوئے جو ہم نے سامنے لگے ہوئے قدآدم آئینے میں اپنی شکل دیکھی تو ہم ایک دم دھک سے رہ گئے، ہمارا منھ کھو ناکا کھو نارہ گیا۔ آئینے میں اپنے عکس کے پیچھے نہایت خونخواری کے عالم میں آپا جان کا غضب ناک چہرہ نظر آیا۔ ان کے ہاتھ میں جوتی تھی اور وہ حرکت میں آنے والی ہی تھیں۔

آپا جان کیسے آگئیں۔ اس پر غور کرنے کا بالکل موقع نہ تھا۔ مگر ہمارے زرخیز دماغ کی داد دیجیے کہ ہم نے فوراً ہی اپنی بچت کا سامان کرلیا اور لپک کے آپا جان کے قدموں پر گر پڑے، جس کے نتیجے میں، تھوڑی بہت ڈانٹ پھٹکار اور جوتے کاری کے بعد انھوں نے ہماری جان بخش دی اور سگرٹ کا ٹن انھوں نے

کنوئیں میں پھینک دیا۔

اس حادثہ کے بعد ہر چند کہ ہم محتاط ہو گئے اور گھر کے بجائے اسکول میں انٹرول کے دوران سگرٹ پی لیتے، لیکن اس کے باوجود مہینے میں ایک آدھ بار کبھی سگرٹ پیتے پکڑے جاتے، کبھی منہ سے سگرٹ کی بو آنے پر لے دے ہوتی، کبھی کسی کونے سے ہماری سگرٹ یا سگریٹوں کا اسٹاک پکڑا جاتا تو نوبت یہاں تک پہونچی کہ ہمارے سگرٹ نہ چھوٹنے سے مایوس ہو کر ہمیں سمجھایا جانے لگا۔

"اگر پینا ہی ہے تو جب بڑے ہو جاؤ تب پینا۔"

"ٹوکنے سے بے حیا ہو جائے گا۔"

"کلیجہ جل جائے گا۔ بڑھوار مر جائے گی کٹ کٹ ایسے رہ جاؤ گے۔"

بڑے ہونے کا عام معیار کم از کم بی اے پاس کرنے تک تھا۔ لیکن اتنی تاب کہاں۔ رفتہ رفتہ گھر والوں نے ہماری سگرٹ نوشی کی طرف سے چشم پوشی شروع کی۔ ناشتے یا کھانے کے بعد اگر ہم ڈرائنگ روم یا کوٹھے کا رُخ کرتے تو لوگ سمجھ جانے کے باوجود کچھ نہ کہتے۔

ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد ہم نے چاہا کہ سگرٹ باقاعدہ کھل کر پی جائے لہٰذا نانی جان دادی جان اور والدہ صاحبہ کے سامنے ہم نے بڑی ڈھٹائی کے ساتھ سگرٹ پینے کی ریہرسل کی۔ مگر معاملہ چند گھرکیوں سے آگے نہ بڑھا۔

یہ بات نہیں کہ ہم سگرٹ پینے کے لیے بیتاب رہتے، یا ہماری نظروں میں یہ کوئی بہت اچھا فعل تھا۔ بلکہ یہ بات تھی کہ سگرٹ پینے کی تو ہماری عادت پڑ چکی تھی اور نہ بھی اس حد تک کہ سگرٹ نہ ملنے کی صورت میں بے تاب ہو کر ہم نے بارہا نہ صرف

بیڑی پی بلکہ حقے تک کے دم لگائے، لیکن اس کے باوجود ہم ہمیشہ سگرٹ چھوڑنے کے امکانات پر بھی غور کرتے رہتے، کیوں کہ ایک طرف تو اس سے گھر میں ہماری ساکھ پر خراب اثر پڑتا۔ دوسری طرف کھانسی رہتی اور گلا خراب ہو جاتا۔

عام طور پر ہم یہ طے کرتے کہ ٹھیک ہو کل سے سگرٹ پینا بالکل چھوڑ دیں گے اس خیال کے ساتھ کہ کل سے تو ہمیشہ کے لیے چھوڑ ہی دیں گے، لہٰذا اس دن کچھ زیادہ ہی سگرٹ پیتے۔ اور اگلے دن جب اٹھتے تو آنکھیں ملتے ہوئے تکیے کے نیچے سے ٹٹول کر سگرٹ اور ماچس کی ڈبی نکال کر سگرٹ سلگانے کے بعد سگرٹ چھوڑنے کے امکانات پر غور کرنا شروع کر دیتے۔

بی اے پاس کرنے کے بعد والد صاحب اور بھائی صاحب کے علاوہ کوئی ایسا نہ تھا جس کے سامنے ہم کھلم کھلا سگرٹ نہ پیتے ہوں، نوکر اور چھوٹے بھائی بہن ہمارے لیے کھٹ سے سگرٹ دکان سے لا دیتے۔ لیکن سگرٹ پینے کا سوراج ملنے کے بعد جیسے جیسے ہماری سگرٹ نوشی کی رفتار بڑھتی جاتی تھی ویسے ویسے ہم اس کو بالکل چھوڑ دینے کے امکانات پر زیادہ سنجیدگی سے غور کرنے لگے۔

ایک دفعہ جاڑے میں "برانڈ" بدلنے کی وجہ سے ہمیں اتنی کھانسی آئی کہ ہم نے مسجد کی دیوار پکڑ کر قسم کھائی کہ "اب اگر ہم سگرٹ پئیں تو ہماری بخشش نہ ہو"۔ اور گھبرا کر ہم نے سگرٹ نہ پینے کا حلف اٹھا لیا۔ سگرٹ توڑ کر پھینک دیے۔ اس کے بعد دن بھر ہماری حالت روزہ دار کی سی رہی۔ جس میں بجائے عبادت کے ہم ایک ایک سے کہتے اور اعلان کرتے رہے۔

ہم نے سگرٹ پینا چھوڑ دیا ہے۔"

گھر والوں نے اس سلسلے میں ہمارا کوئی نوٹس نہ لیا۔ کیونکہ وہ ہمارے سگرٹ چھوڑنے کے اعلانات سے عاجز آچکے تھے اور یہ سن کر ان کے کان پک گئے تھے "اب ہم سگرٹ پینا چھوڑ چکے ہیں"۔

جب ہمارے لنگوٹیے خاں صاحب حسب معمول شام کو دندناتے ہوئے آئے اور انھیں معلوم ہوا تو وہ ہمیں مشکوک نظروں سے دیکھنے کے بعد بے اختیار ہنسنے لگے اور بولے کہ۔

"اگر سگرٹ چھوڑنا ہے تو اس کی ایک دوا آتی ہے وہ پی لو پھر سگرٹ اچھی نہ لگے گی اور خود چھوٹ جائے گی"۔

بات معقول تھی اس لیے ہم سگرٹ سلگا کر دوا کی تلاش میں نکلے اور دوا لا دوا اور سگرٹ دونوں کا کئی دن تک بلاناغہ استعمال کیا۔ جس کے نتیجے میں سگرٹ پینے کی رفتار کچھ اور بڑھ گئی۔ اور دوا ختم ہوگئی۔

رفتہ رفتہ ہم سگرٹ چھوڑ سکنے سے مایوس ہو گئے۔ اسی دوران ہمیں ایک لڑکی سے عشق ہوگیا۔ ہمارا عشق سوڈے کے ابال کی طرح بڑھ رہا تھا۔ مگر اس لڑکی کو سگرٹ سے سخت نفرت تھی۔ مجبوراً کبھی ہم اس کے پاس الائچی چباتے ہوئے جاتے اور کبھی امرود کھاتے، مگر سرباد معاملہ زبانی عشق سے آگے نہ بڑھنے دیتی اور کہتی۔ "ہٹو۔ تمہارے منھ سے سگرٹ کی بو آرہی ہے"۔

یہاں تک کہ ہم ایک دن زندگی کے اس دوراہے پر پہونچ کر کھڑے ہوگئے جہاں ہمیں لڑکی اور سگرٹ میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ ہمارے لیے دونوں میں سے ایک کا چھوڑنا بس میں نہ تھا۔ ہم اسی کشمکش میں مبتلا تھے اور قریب تھا

نتیجہ میں سگرٹ ہم سے چھوٹ جائے اور لیلیٰ مجنوں کو نیچا دکھا کے ہم ثابت کر دیں کہ اس کو کہتے ہیں سچی محبت کہ اس لڑکی کے ابا کا دور بہت دور تبادلہ ہو گیا اور وہ بے وفا ہمیں سگرٹ پیتا ہوا چھوڑ کر بغیر ہم سے ملے یا کسی قسم کا انقلابی فیصلہ کیے چلی گئی۔ اس طرح سگرٹ چھوڑنے کا ایک اور سنہری موقعہ ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔ قبل اس کے کہ ہم دو چار اور نا کام عشق کرتے اور سگرٹ چھوڑنے کا مسئلہ اٹھتا ہماری شادی کر دی گئی۔ بیگم صاحبہ نے سہاگ رات میں پہلا محبت بھرا جملہ جو کہا وہ حسب ذیل تھا۔

"اللہ سگرٹ چھوڑ دیجیے!"

اس کے بعد انھوں نے مسکرا کر ہمارا سگرٹ نیچے پھینک دیا۔ ہم میں اتنی ہمت نہ تھی کہ ہم سگرٹ اٹھا کر اپنی نئی نویلی دلھن کو خفا کرتے۔ لہذا تھوڑی تھوڑی دیر بعد "ابھی آئے" کہہ کر باتھ روم کا بہانہ کر کے جاتے اور ایک سگرٹ پی آتے۔ ہماری بہادر بیوی کو ہماری بزدلی بالکل پسند نہ آئی اور انھوں نے سگرٹ خود منگا کے پلوائے۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ وہ نیک بخت برابر تلقین کرتی رہتی کہ "اگر آپ چھوڑ نہ سکیں تو آہستہ آہستہ سے کم کر دیں۔"

لہذا ہماری گھر میں سگرٹ کم ہوتی گئی اور گھر کے باہر سگرٹ پینے کی رفتار بڑھتی گئی۔

جب انھوں نے دیکھا کہ شوہر نامدار اب باہر زیادہ رہنے لگے ہیں تو ہمارے اوپر سگرٹ کے سلسلے میں لگائی ہوئی پابندیاں نرم کر دی گئیں اور ہم باہر کے مقابلے میں گھر میں زیادہ رہنے لگے۔

سگرٹ تو ہم اب بھی پیتے ہیں مگر ہماری سگرٹ نوشی پر اب بیگم صاحبہ اس قدر عادی ہو چکی ہیں کہ اگر ہم دن بھر میں ایک سگرٹ بھی پی لیں تو دن بھر میں کئی سو بار اس پر تشویش کا اظہار کرتی ہیں کہ۔

"آپ آج کل اتنی زیادہ سگرٹ پی رہے ہیں کہیں آپ کے دشمنوں کو کچھ ہو نہ جائے۔"

چونکہ سگرٹ سے ان کو ہر بیوی کی طرح ازلی بغض ہے۔ اس لیے اس سلسلے میں ان کی باتیں بھی بڑی جلی کٹی ہوا کرتیں۔ مثلاً ایک دن جو کہیں چائے کی پیالی میں سگرٹ کا گل گرا پایا تو انھوں نے ہم سے کہا۔

"اگر آپ چائے کی پیالی میں سگرٹ کا گل گرا دیں گے تو پھر ہم آپ کو ایش ٹرے میں چائے پلائیں گے۔"

ان پابندیوں میں خیر ہم سگرٹ تو کیا پیتے ہیں بس یہ سمجھ لیجئے کہ سگرٹ پر بیٹی کو گورنمنٹ کی راشننگ کے بعد سے عام طور پر ایک ہی سگرٹ کو دن میں کئی کئی بار سلگا سلگا کر پیا کرتے ہیں اور بلیک کی سگرٹ اب بھی وہیں چھپ چھپ کر پیتے ہیں جہاں سے ہماری "انڈر گراؤنڈ اسموکنگ شروع ہوئی تھی۔

ریڈیو سے خریدو!

حرام خوری کے ساتھ ساتھ منافع خوری بھی جب حد سے بڑھ گئی اور
پانی سر سے اونچا ہو گیا تو جہاں بہت سے بلیک مارکیٹئے تبدیلِ آب وہوا
کے لئے سرکاری مہمان خانوں اور بڑے گھروں میں بھیج دیے گئے وہاں
اخباروں میں ضروریاتِ زندگی کی اشیاء کی قیمتوں کی سرکاری فہرستیں
چھپنے لگیں اور ریڈیو سے روزانہ ہر چیز کے بالکل اصلی دام نشر ہونے
لگے۔ کہ اس چیز کے یہ دام ہیں اور اس کے یہ۔ اس سے زیادہ نہ دیجئے
اگر اس سے زیادہ کوئی دکان دار مانگے تو آپ اُس سے قیمتوں کی
فہرست طلب کیجئے، اور اس پر بھی نہ مانے تو اس ہٹ دھرمی کی اطلاع
اپنے قریبی تھانے یا چوراہے کے سپاہی کو دیجئے۔"

قیمتوں کی سرکاری فہرست جب ہم نے پہلی بار سنی اور پڑھی تو

ہمیں بالکل وہی خوشی ہوئی جو پنڈت نہرو کی تقریر سُن کر ہم اکثر کی
تھی اور ہمیں ایک بار پھر اپنے دلدر دور ہوتے، اور اپنے پیارے سے
وطن میں سوشلزم آنے کا یقین سا ہو گیا۔ کیوں کہ سرکاری حساب،
کے حساب سے ہم کو چیزیں ملنے لگیں تو نہ صرف ہماری ہر خواہش پر دم
نکلنے والی سب ضرورتیں پوری ہو جائیں گی بلکہ پُرانے قرضے اور
وہ مارشل ایڈ جو ہم ابتک اپنے عزیزوں اور دوستوں سے لے چکے
تھے جس کی آسان قسطوں پر ادائیگی کے لیے ہم اور قرض بھی لیتے رہتے
تھے، مگر اس کی ادائیگی سے زیادہ نئے قرضے حاصل کرنے کی نت نئی منصوبہ
بندیاں کیا کرتے تھے ان سب کے یک لخت ادا کر سکنے کے ساتھ اس
کمر توڑ مہنگائی میں وقت بے وقت کے لیے اپنی گانٹھ میں بھی کچھ نہ کچھ
بچ رہنے کے امکانات بہت روشن ہو گئے۔

مہینے کی ۳۱ تاریخ تک ہم اشیاء کی فہرست سے دل بہلاتے اور
اسے دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے رہے، لیکن پہلی تاریخ کو ہم نے تنخواہ ملنے
کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ ایک بار پھر احتیاطاً اور غور سے ریڈیو پر بازار
کا تازہ ترین بھاؤ سنا کہ۔

"بھلا اب کیا چیز کس دام ملے گی" اور آج کے تازہ اخبار سے
قیمتوں کا سرکاری فہرست کی کٹنگ کاٹ کر جیب میں احتیاط سے تہہ
کر کے رکھ لی۔ اور ضروریات زندگی کی خریداری کی مہم پر اتنے اطمینان
سے نکلے جیسے جیب میں آئی ڈینٹٹی کارڈ ڈال کر ہم سینما کے لیے نکلا کرتے تھے

چوں کہ ہمارے فیملی بجٹ میں نئے حساب کی رعایت سے ایک معقول رقم بچ رہی تھی، جس کی خانہ پُری کے لیے ہم نے طے کیا کہ اپنی پیاری بیگم کو خوش کرنے کے لئے سامانِ آرائش میں کریم، پاؤڈر وغیرہ کا بھی اپنی فہرست میں فراخدلی سے اضافہ کرلیا جائے۔

گھر سے نکل کر ہم نے بازار کا چکر اس طرح لگایا جیسے لوگ سینما کا ٹکٹ خریدنے کے بعد لگے ہوئے اور آئندہ آنے والی فلموں کی تصویر شوکیسوں میں دیکھا کرتے ہیں۔ ہر دوکان کے سامنے ہم احتیاطاً رک جاتے اور غور سے ایک ایک کو تاکا کرتے۔ مگر ہمیں ایک بھی دوکان میں قیمتوں کی فہرست نہیں دکھائی دی۔ تعجب تو ہمیں اس بات پر ہوا کہ اس سرکاری حکم کے باوجود کہ "جو دوکان دار اپنی دوکان کے باہر نمایاں طور پر قیمتوں کی فہرست نہ لٹکائے گا اس کو جیل بھیج دیا جائے گا۔ دوکانوں پر بجائے فہرستوں کے دوکان دار نظر آرہے تھے۔

بڑی تلاش کے بعد ایک کھٹیا والے کی دوکان پر ہمیں فریم کی ہوئی قیمتوں کی فہرست بہ مشکل تمام نظر آگئی۔ لیکن جب ہم دوکان کے قریب پہنچے تو وہ اگیا بتیال کی طرح غائب ہوگئی۔ بہت غور کرنے کے بعد اس کا معمہ ہماری سمجھ میں آیا۔ دراصل جب ہم کو قیمتوں کی فہرست نظر آئی تھی اس وقت دوکان دار نظر نہیں آیا تھا۔ اب تک ہمیں دوکاندار نظر آیا تھا۔ لیکن اس بار فہرست دکھائی دی تھی۔ اس لیے ہم سمجھے کہ

اس دوکان پر فہرست شاید اس لیے نظر آ رہی ہے کہ اس کا دوکان دار جیل میں ہے۔ لیکن تھوڑی دیر بعد ہمیں دوکان دار نظر آیا۔ اور فہرست غائب ہو گئی۔

در اصل ہوا یہ تھا کہ جب ہمیں قیمتوں کی فہرست نظر آئی تو دکاندار اس لیے نظر نہیں آیا کہ وہ جھکا ہوا گاہک کے لیے ریوڑیاں نکال رہا تھا۔ ریوڑیاں نکالنے کے بعد وہ سیدھا بیٹھ گیا اور چوں کہ وہ قیمتوں کی فہرست پر تکیہ کیے بیٹھا تھا۔ ہمارا اشتیاق بڑھتا جا رہا تھا۔ لہٰذا ہم نے دل کڑا کر کے اس سے فہرست مانگ ہی تو لی۔۔ وہ ہمیں خفیہ پولس کا آدمی سمجھ کر دونوں ہاتھ جوڑ کر اس انداز سے گھگھیاتا ہوا بالکل دوہرا ہو گیا کہ اس کے ذرا ترچھے ہوتے ہی فہرست بالکل ہمارے سامنے آ گئی۔

لیکن بہت غور کرنے کے بعد بھی ہم اُسے بالکل نہ پڑھ سکے۔ کیونکہ وہ "اڑیہ" میں لکھی ہوئی تھی اور ہم تامل اور تلگو کی طرح "اڑیہ" بھی نہیں جانتے۔ جہالت کی وجہ سے ہماری بات چیت میں جو نرمی اور شرافت پیدا ہوئی اس سے کھٹیا والے کو شبہ ہوا کہ ہم خفیہ پولس کے آدمی نہیں ہیں۔ لہٰذا اُس کا رویہ بہت سخت ہو گیا اور اس نے ہمیں فہرست اتنا گھڑک کر سنائی کہ جس میں فہرست کم اور ڈانٹ زیادہ تھی۔ بہت ممکن ہے کہ گالیاں بھی ہوں اس کے ساتھ اُس نے ہم پر یہ بھی واضح کر دیا کہ

"بابو یہ دوکنداری کا ٹیٹم ہے۔ لینا ہو لو، ورنہ آگے کا راستہ لو!"
اس کے بعد ہم نے جیب سے اخبار کا تراشا نکال کر قیمت ملانا چاہی تو ہم بالکل خاموش ہو گئے۔ سرکاری فہرست میں ریوڑی کا سرے سے ذکر ہی نہ تھا۔ کیوں کہ ریوڑی آدمی روز نہیں کھاتا اور بغیر کھٹیا کھائے بھی زندہ رہ سکتا ہے۔ لہذا ریوڑی کا شمار ضروریاتِ زندگی میں نہیں کیا جا سکتا۔

پھر ہم نے جیب سے فیملی بجٹ نکالا۔ مگر اس میں بھی ریوڑی کا نام تک نہ تھا۔ لہذا ہم بالکل چپ چاپ آگے بڑھ گئے اور وہ ہم کو گھورتا ہی رہ گیا۔

اس کے بعد ہم نے ایک جنرل مرچنٹ کی دوکان پر نظر ڈالی تو بلیڈ رکھے ہوئے دکھائی دیے۔ ہمارے فیملی بجٹ میں بھی بلیڈ کا تذکرہ تھا اور اس کے آگے ساٹھ پیسے سرکاری قیمت کے طور پر درج تھے۔ دوکان کے شیو کیس میں سے شیونگ کریم، ٹوتھ پیسٹ، آفٹر شیونگ لوشن، پاؤڈر، صابن، کریم اور کافور کی گولیاں غرض ضرورت کی تقریباً ہر چیز دکھائی دی۔ لہذا ہم نے اس سے ضرورت کی تمام چیزیں مانگیں۔ اُس نے نہایت مستعدی سے ہمارے سامنے ہمارے فیملی بجٹ کا ڈھیر لگا دیا۔ اور اس کے جواب میں اُس نے ہمیں جو بل تھمایا وہ ہمارے بجٹ سے تیوگنا اور قطعی خسارے کا بجٹ تھا۔ اس پر ہم نے اس سے بحث کرنا چاہی مگر وہ گاہکوں میں اتنا

مصروف تھا کہ اس نے بجٹ سیشن میں حصہ لینا تو دور کی بات ہوئی ہمیں کوئی خاص لفٹ ہی نہ دی۔ ہم نے مجبوراً آپے سے باہر ہوتے ہوئے کہا۔

"غضب خدا کا بلیڈ کے پیکٹ کی قیمت ۶۰ پیسے ہے یہ تم نے ۹۰ پیسے کیسے لکھ دیئے۔؟

صابن کی قیمت ۴۰ پیسے ہے اور تم ۸۰ پیسے لکھے پڑے ہو۔؟"

اس نے نہایت اطمینان سے کہا۔

"بالکل ایک دام صاحب۔ نو کمی بیشی۔"

ہم نے غصہ روکتے ہوئے کہا۔

"تمھاری قیمتوں کی فہرست کہاں ہے؟"

اس نے ایک ٹائپ کی ہوئی فہرست اپنے کیش بکس سے نکال کر ہمارے سامنے رکھ دی جو بنگالی میں تھی اور افسوس کہ ہم تامل، تلگو اور اڑیہ کی طرح بنگالی بھی نہیں جانتے۔ ہمیں اپنے گھر والوں اور ماسٹروں پر بہت سخت غصہ آیا کہ انھوں نے ہمیں اردو، انگریزی، فارسی اور ہندی کے ساتھ، تامل، تلگو، کنٹری، اڑیہ، مہاراشٹری، گجراتی، ملیالم، پنجابی، بنگالی، نیپالی اور بھوجپوری وغیرہ کیوں نہیں سکھائی۔ ورنہ آج ہم اتنے عالم فاضل ہونے کے باوجود اڑیہ کی طرح بنگالی سے بھی نابلد نہ ہوتے۔ ہم نے انتہائی بے بسی کے ساتھ کہا۔

"مگر بابا! ہمیں ریڈیو پر تو بلیڈ کے دام ۶۰ پیسے، صابن کے ۴۰ پیسے شیونگ کریم کے بیس آنے اور پاؤڈر کے ۲ روپے بتائے گئے تھے"
اس نے کہا۔

"ہاں بتائے گئے تھے تو پھر؟"
ہم نے لاجواب ہوتے ہوئے کہا۔
"پھر یہ کہ تم اسی بھاؤ دو۔!"
وہ ڈھٹائی کے ساتھ بولا۔

ہم نے اپنا ریٹ بول دیا۔ "تم ریڈیو کا بھاؤ بتاتا ہے - ہم سے لینا ہے تو ہمارے دام دو۔ ورنہ جاکر ریڈیو سے خریدو"
غصہ تو ہمیں بہت آیا مگر وہ "کیش میمو" کاٹ چکا تھا اس لئے مجبوراً ہم نے سامان کھلے بازار میں بلیک سے خرید لیا اور آگے بڑھ گئے۔
اب ہمیں کپڑا خریدنا تھا۔ کپڑے والوں کے یہاں ہم نے کپڑے کم دیکھے اور قیمتوں کی فہرست زیادہ تلاش کی۔ ایک کپڑے والے کے یہاں ہماری پسند کے کپڑے تو ہمارے سامنے تھے، مگر قیمتوں کی فہرست دکان میں سب سے اوپر ایک کونے میں لگی تھی۔ جس پر ایک بلب ٹمٹما رہا تھا۔ اس کے آگے کسی کی مورتی کے سامنے اگربتی سلگ رہی تھی۔ جس کی دھونی میں فہرست کو دوربین اور ٹارچ کی مدد سے پڑھنا بھی ممکن نہ تھا۔ مجبوراً ہم نے اس سے فہرست مانگی اس نے نہایت اطمینان سے ایک سیڑھی کی طرف اشارہ

گیا کہ اس پر چڑھ کر فہرست سے، شوق فرمایئے۔ مگر ہمیں یہ سب کچھ عجیب سا لگا۔ بلکہ اتنا بُرا لگا کہ ہم دوکان سے باہر نکل آئے۔
اس کے بعد ہم جس دوکان پر بھی گئے وہاں کسی نہ کسی جناتی زبان میں قیمتوں کی سرکاری فہرست تو ضرور ملی یا دکھائی دی، مگر کسی بھی چیز کے مناسب دام کی فرمائش کا یہی جواب ملا کہ
"ریڈیو سے خریدو!"

گھر میں رہنا

آج کل میں گھر پر رہنے کی مشق کر رہا ہوں، مگر اس کا ہر گز یہ مطلب نہیں کہ اس سے پہلے میں جنگل میں رہتا تھا یا مجنوں کی طرح صحرا نشین تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ میں اسی گھر میں پیدا ہوا، پلا بڑھا، لیکن اس انداز سے کہ بچپن کھا کھیل کر، سیر سپاٹے میں گزار دیا اور جب ہم مل کر جوان ہوئے، اس تیور سے کہ عمر کٹی ہوٹلوں میں، اور رہنے کے بارے میں، جہاں تک غور کرتے ہیں، بس یہی یاد آتا ہے کہ حضرت داغ کی طرح جہاں بیٹھ گئے، بیٹھ گئے، لیٹ گئے، لیٹ گئے اور سو گئے تو پھر سو ہی گئے، چنانچہ، ہر گھر، گھر ہی معلوم ہوتا تھا۔ طبیعت میں اتنا چھوٹا پن نہ تھا کہ میرے اور تیرے کی تفریق پیدا ہو جاتی۔

چوں کہ ٹائم ٹیبل بنا کر زندگی گزارنے کے پہلو پر کبھی غور نہ کیا تھا۔ اس لئے جب بھی کوئی ہم سے ملنے آتا تو گھومنا، پھرنا، کھانا پینا، گپ شپ اور سیر تفریح کا

ایسا سلسلہ چل نکلتا جس کی وجہ سے کبھی وہ ہمارے یہاں رہ جاتا اور کبھی ہم اس کے یہاں پڑ رہتے، کبھی دونوں کسی تیسرے کو شرف میزبانی بخشتے۔ یہی حال کپڑوں لتوں کا تھا، کبھی غور ہی نہ کیا کہ ہماری کیا کیا چیزیں احباب کے استعمال میں ہیں یا دوستوں کا کیا کیا سامان ہمارے مصرف میں ہے۔

ایک تو خوش اخلاق اوپر سے یار باش۔ گویا ایک تو کڑوا کریلا پھر نیم چڑھا لہٰذا گھر تو گھر کبھی اپنے شب و روز کا شمار نہ کیا۔

ہماری باقی زندگی بھی اسی بے فکری میں ہنس کھیل کر گزر جاتی اگر ہمارے دروازے پر بکری نہ باندھ دی جاتی۔

خیر "گھر میں" بکری کا بندھا رہنا ہرگز کوئی ایسا فعل نہ تھا جس سے معمولات میں فرق آتا، لیکن بکری کے منمنانے سے ضرور تہلکہ مچ گیا اور ہمیں زندگی میں پہلی بار چھٹی کا دودھ یاد آ گیا۔

ہوا یہ کہ شادی کے بعد یار لوگوں نے تالابوں میں جال اور کنوؤں میں بانس چھڑوا دیئے، مگر کیا مجال جو کوئی ہماری بو بھی پا سکا ہو، اگر دور سے کوئی نظر بھی آ گیا تو چپکے سے کترا گئے۔

اگر ایسے ویسے ناشناس حضرات جن کا پہلے سے گھر میں آنا جانا تھا، آن دھمکے تو ہم نے ان کو بہت صفائی سے کاٹ دیا، یا قلعہ بند ہو گئے لیکن محاصرے کی حالت بہت جلد ختم ہو گئی اور چھوٹے موٹے کاموں کے سلسلے میں گھر کے باہر بھی دکھائی دینے لگے، مگر بس اس حد تک کہ کتے کی چال جاتے اور بلی کی چال آتے۔

شامت جو آئی تو ایک دن اسی قسم کے کسی گھریلو کام سے لپکتے ہوئے نکلے

تو ہمارے پرانے لنگوٹیے خاں صاحب نے بیچ سڑک پر راستہ روک کر خوب ہی تو ہمیں آڑے ہاتھوں لیا، اور ہم نے جو انھیں جھکائی دینا چاہی تو انھوں نے ہمیں "زن مرید" کا ایسا طعنہ دیا کہ ہماری رفتار یک لخت سست پڑ گئی۔

خاں صاحب نے تقریباً روہانسے ہوتے ہوئے کہا "گویا بھابی سب کچھ اور ہم کچھ نہیں۔"

اس جملے نے امرت دھارا کا کام کیا اور ہمیں ترس آگیا "اگر تھوڑی دیر اپنے پرانے ساتھی کے ساتھ ہنس بول لیا جائے تو کیا مضائقہ، کچھ دیر سویر ہی کوئی گورنمنٹ کرفیو آرڈر تو لگا نہیں دے گی" ہم ابھی یہ سوچ ہی رہے تھے کہ خاں صاحب نے نیم طنزیہ انداز میں کہا۔

اگر زحمت نہ ہو تو غریبوں کی ایک کافی قبول کر لی جائے، سرکار کے تو مزاج ہی نہیں ملتے۔

ہم جواب میں سر جھکا کر خاموشی کے ساتھ کافی ہاؤس میں داخل ہو گئے، کافی کے گھونٹ کے ساتھ خاں صاحب نے ایک ادبی بحث چھیڑ دی، ان کا کہنا تھا کہ!۔

"انگریزی فوجیں لکھنؤ میں عالم باغ کی طرف سے داخل ہوئیں تھیں اور ہمارا دعویٰ تھا کہ چار باغ کی طرف سے" اب جو بحث مباحثہ ہوا تو کافی ہاؤس بند ہونے کے بعد ایک ہوٹل میں جمے، اس کو بند کرانے کے بعد ایک بند دکان کی سیڑھی پر منھ سے جھاگ اڑاتے رہے، بحث کے دوران شدید ترین اختلاف کے باوجود کبھی ہم انتہائی ضبط سے کام لیتے اور کبھی خاں صاحب اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ قابو میں رکھنے کی کوشش کرتے، جس کی وجہ سے ہم لہولہان تو نہیں ہوئے

مگر پسپا ضرور ہو گئے اور طے یہ پایا کہ گھر پر چل کر کھانا کھایا جائے۔ ہیڑ پر جائے بنے، اس کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کو قائل بھی کر دیں۔ لیکن اب بات انگریزوں کے لکھنؤ میں داخلے سے پھلانگ کر میر جعفر کے شجرے تک پہونچ چکی تھی۔

دوکان کی سیڑھیوں کی جاں بخشی میں ہمارا کوئی ہاتھ نہ تھا چوکیدار سوچ رہا تھا کہ ہم لوگ یہاں سے ہٹ جائیں، تو وہ اطمینان کا سانس لے، ہماری گرما گرم بحث نے اس کی نیند میں خلل ڈال رہا تھا۔ دوسرے پولس والے خاصی مشکوک نظروں سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ لہذا مناسب یہی تھا کہ بات چیت کا دوسرا دور گھر پر چلے۔

گھر کے پھاٹک پر پہونچ کر بے شمار آوازیں دے ڈالیں، مگر کوئی خاص نتیجہ برآمد نہ ہوا اس کے بعد گھنٹی بجاتے، کنڈی کھٹ کھٹانے اور پھاٹک دھپ دھپانے سے لے کر باکسنگ کی مشق تک کر ڈالی۔ تقریباً مایوس ہو کر پلٹنے ہی والے تھے کہ ایک انتہائی غضب ناک آواز ہمارے کانوں سے ٹکرائی

"صبح تشریف لائیے گا!"

اس آواز کے ساتھ ہمیں پہلی بار، وقت اور گھر سے غائب رہنے کا احساس ہوا، گھڑی دیکھی تو صبح کے پانچ بج رہے تھے، پلٹ کر دیکھا تو آواز کے ساتھ ہی خاں صاحب غائب غلہ ہو چکے تھے۔

پھاٹک کے پیچھے بیگم لرزہ بر اندام تھیں اور پھاٹک کے باہر سڑک پر ہم بیگم کی توپ سے شہید ہونے کی تیاری کر رہے تھے۔ جب کسی تیسرے کی موجودگی کا خطرہ نہ ہو تو با آسانی بیوی کی خوشامد کی جا سکتی ہے۔ مگر اس میں

دو اندیشے تھے۔ ایک تو یہ کہ کوئی پڑوسی ہمارے ڈائیلاگ نہ سن لے اور دوسرے معاملہ طول نہ کھینچ جائے۔ اس لیے ہم نے ایک اور پینترا بدلا اور بجائے گفت و شنید یا خوشامد درآمد کے اپنے اوپر نہایت ہی نقاہت طاری کرتے ہوئے، ہچ کرا کر کے دو تین بار زور سے کراہ دیئے۔

بیگم نے فوراً تڑپ کر پھاٹک کھول دیا اور گھبرائی ہوئی ننگے پیر باہر نکل آئیں اور جلدی سے ہمیں سہارا دے کر گھر میں لے گئیں۔ باب جنت وا ہونے کے بعد خمارِ گندم سے بچنے کے لیے ہم نے اپنے آپ کو تقریباً بے ہوش ثابت کرنے کی کوشش کی۔

بیگم بے چاری، حیران پریشان، کبھی ہمارے منھ پر پانی کے چھینٹے مارتیں کبھی سینٹ کی شیشی سنگھاتیں اور کبھی آیۃ الکرسی پڑھ کر دم کرتیں۔ اتنے میں اس معصوم کے موٹے موٹے گرم گرم آنسو، ہمارے خوف سے ٹھنڈے چہرے پر پڑے اور ہم نے ڈر کے مارے آنکھیں کھول دیں۔ انھوں نے تقریباً ہمارے اوپر آپ کو قربان کرتے ہوئے پوچھا۔

"یہ آپ کے دشمنوں کو کیا ہو گیا ۔۔۔؟"

چونکہ اس کے آگے ابھی ہم نے خود بھی سوچا نہ تھا اور موجودہ حالات میں ہماری ذرا سی بے سوچی سمجھی بات ہنگامی حالات پیدا کر کے صورت حال کو قابو سے باہر کر سکتی تھی۔ لہٰذا ہم نے آنکھیں نیم وا کرتے ہوئے اپنے ہونٹ پر انگلی رکھ کر آہستہ سے کہا۔

"شی ۔۔۔۔۔"

جس کے بعد بیگم سمجھ گئیں کہ میرے بیمار کو ابھی مکمّل آرام کی ضرورت ہے خاموشی سے تیمارداری میں مصروف ہوگئیں۔

دو دن کے بعد کافی سوچ سمجھ کر ہم نے ایک فرضی حادثے کی داستان، کافی نمک مرچ لگاکر بیگم سے بیان کی کہ :-

"کس طرح ہم ایک تیز رفتار موٹر کی ہیں آگئے اور کس طرح بدقّت تمام پارک پہونچ کر ساری رات بے سدھ پڑے رہے۔ اور کیوں کر خدا نے ہمیں بال بال بچا لیا، چوٹ تو نہیں آئی مگر اعصاب پر حادثے کی دہشت نے ہماری یہ گت بنا دی!"

خیر اس بار بیگم کے عتاب سے بچ نکلنے کے بعد ہم نے پکا ارادہ کرلیا کہ..

"اب ہم گھر پر رہیں گے اور گھر میں بھی بیگم کے پاس منڈلائیں گے، باہر ہرگز نہ جائیں گے اور اگر کسی کام سے جانا بھی پڑ گیا تو فوراً واپس آجائیں گے۔"

اس سلسلے میں ہم نے "ہوم سوئٹ ہوم" قسم کی کتابیں پڑھیں، "ڈاکٹر ٹاؤن" سے خط و کتابت کے ذریعے استفادہ کیا اور "گھر سنسار" ٹائپ کے فلم دیکھے گھر میں ہر شخص سے فرداً فرداً تاکید کردی کہ "سوائے سسرال والوں، ممی اور ڈیڈ والے اور دفتر کے چپراسی کے علاوہ جو بھی آئے اس کو راستہ بتادو کہ "ابھی ابھی کہیں باہر گئے ہیں!"

ہر چند کہ بیگم کہتیں بھی کہ "ایسا بھی کیا.... دل بہلانے کے لیے

کبھی کبھار ایک آدھ دوست سے ایک آدھ منٹ کے لیے مل لیا کیجیے؛
مگر ہم جانتے تھے کہ اگر ایک دوست کے ساتھ بھی بیٹھے تو پھر بیٹھک جم جائیگی
ایک جائے گا تو چار آئیں گے ۔ ۔ ۔ ۔ پھر کیا ہوگا؟ "

گھر میں رہنے کے خیال سے ہم نے ضروری سمجھا کہ گھر کی صفائی ستھرائی
سجاوٹ، پیڑوں، بیلوں، گملوں، کیاریوں، پودوں اور پھولوں کی آرائش
میں بھی دلچسپی لی جائے۔ ناشتے اور کھانے کے معیار کو بہتر بنانے پر توجہ
دی جائے۔

چنانچہ سب سے پہلے ہم نے "فن باغبانی" منگوا کر اس کا بغور مطالعہ
کیا، پھر پھل دار پیڑوں اور پھول دار پودوں کے بیج لائے اس کے بعد ہم
نے باوا آدم کے زمانے کے تمام پرانے پیڑ، پودے اور بیلیں کاٹ کر کوڑے
پر پھنکوا دیں۔

غرض جب گھر میں ہریالی کا نام نہ رہا تو ہم نے گھر میں جگہ جگہ بیج بو دیے
کافی جوتنے بونے اور کھاد ڈالنے کے بعد بھی جب گھر میں ایک انکھوا بھی نہ پھوٹا
تو ہمیں اپنی تازہ ترین ناکامی کے اسباب کی جستجو ہوئی ۔ خاصی تحقیق کے بعد
ہم پر یہ انکشاف ہوا کہ بیج گرم مسالے کے ڈبے میں رکھنے کی وجہ سے گھر میں
تقریباً استعمال ہو چکے ہیں اور جو چیزیں ہم نے گھر بھر میں جابجا کیاریوں
اور گملوں میں بوئی تھیں وہ لاکھ اور چپڑے کا چورا تھا جو رنگ ملانے کے
لیے خاص طور پر منگوایا گیا تھا اور رنگ رہا تھا۔

اس سے قبل کھانے میں اصلاح کے سلسلے میں اکثر گھر والے ہمارے

نمک مرچ سے جزبز ہو چکے تھے۔

گھر کی سجاوٹ کے سلسلے میں اس دن گھر کا گھر ہم سے باغی ہو گیا۔ جب ہم نے صفائی کے خیال سے گھر بھر کا سامان ایک جگہ اکٹھا کیا اور گھر میں کوڑا اچھوڑ کر تکان کی وجہ سے بے خبر سو گئے۔

لہٰذا ہر محاذ پر پسپا ہونے کے بعد ہم نے پھر اپنے گھر میں رہنے کی پالیسی پر از سر نو غور کیا اور اس میں نمایاں تبدیلیاں کر کے اپنے دائرۂ عمل کو گھر میں رہنے تک محدود کر دیا۔

اس کا ایک خوش گوار اثر بیگم پر یہ ہوا کہ وہ ہماری عام گھریلو سرگرمیوں کی جانب سے بے فکر ہو گئیں اور ان کے کام کا بار خاصہ کم ہو گیا، لیکن ہمارے چاہنے والے ضرور ہمارے لیے دردِ سر بنے رہے۔ کسی کو شکایت تھی کہ:۔

"اجی گھر میں ہوتے ہوئے کہلوا دیتے ہیں کہ "نہیں ہیں"؟

کسی کو شکوہ تھا کہ:۔

"بد دماغ ہو گئے ہیں... ملنا ہی نہیں چاہتے!"

اس کا نتیجہ یہ ضرور رہا کہ ہم گھر پر رہنے کی کوشش ضرور کرتے، مگر گھر پر نہ رہ پاتے۔ کوئی نہ کوئی صورت ایسی پیدا ہو جاتی کہ زیادہ تر ہمیں باہر رہنا پڑتا۔

جب مقامی ملاقاتیوں کی بھیڑ کباڑ پر خدا خدا کر کے کچھ کنٹرول کر سکے تو شہر کے باہر سے آنے والوں کے مسئلے نے سر اٹھایا۔ شروع شروع تو بیگم بھی خوش ہوئیں کہ:۔

گھر میں رہنا

ہمارے وہ بھی کس قدر بڑے آدمی ہیں کہ جب دیکھو کوئی ماسکوٹ چلا آرہا ہے تو کوئی نیویارک یا لندن سے اور کلکتہ بمبئی، دہلی حیدرآباد وغیرہ سے کسی کا آجانا تو بڑی معمولی بات ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے دیکھا کہ ان باہر سے آنے والوں نے ہمارا گھر میں رہنا دوبھر کر دیا ہے۔ اور بیگم کا اب تزلزل گرنے ہی والا ہے۔ تو ہم نے ایک دن جان کی امان پانے کے بعد ان سے دست بستہ گزارش کی ” اگر آپ واقعی چاہتی ہیں کہ ہم گھر پر رہیں اور زیادہ سے زیادہ رہیں تو اس کی فی زمانہ ایک ہی صورت نظر آتی ہے کہ:۔

” اب میں فقیری لے لوں اور تارک الدنیا ہو جاؤں “

مگر انھوں نے ہماری اس تازہ ترین رائے سے بالکل اتفاق نہ کیا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ہمارے لیے فی الحال فقیری لینا خاصا قبل از وقت ہوگا۔

لہذا ہم نے پھر دنیا میں رہتے ہوئے گھر میں رہنے کے امکانات پر غور و خوض کیا۔ یہ نکتہ بھی سمجھنے کی کوشش کی کہ گھر میں رہنا آرٹ ہے یا سائنس؟ تو اس نتیجے پر پہونچے کہ اس کا تعلق آرٹ یا سائنس سے زیادہ ”کاروبار“ سے ہے، یعنی اگر آپ گھر میں رہنے کی نیت سے گھر کے جھیلوں میں پڑ جائیں تو بڑی حد تک گھر میں رہ سکتے ہیں۔

یہ بات سمجھ میں آتے ہی ہم نے گھر میں کھلم کھلا رہنے کا ایک خفیہ منصوبہ بنا لیا، جس کے مطابق ہم ملاقاتی کے آتے ہی اس کے ساتھ شاپنگ کرنے یا کسی بھیڑ بھاڑ والے ڈاکٹر کے یہاں وہ اپنے پونچ جاتے۔

بازار اور ڈاکٹر کے مطب کی بھیڑ بھاڑ کی سیر کے بعد پھر وہ ہمارا پیارا

برسوں شکل نہ دکھلانا۔ کچھ کو ہم آگ لینے تو نہ بھیج سکے، مگر ایسے ضروری کاموں سے ضرور بھیجا کہ وہ پھر لوٹ کر نہ آئے۔

اس سے فائدہ یہ ہوا کہ اب ہم ڈنکے کی چوٹ گھر پہ رہتے ہیں، کھلم کھلا ڈرائنگ روم میں بیٹھتے ہیں اور دندناتے ہوئے باہر نکلتے ہیں، لیکن دور دور تک نہ کوئی دوست نظر آتا ہے نہ ملاقاتی۔

عملاً "گرہست آشرم" میں داخل ہونے کے بعد ہمارا دعویٰ ہے کہ اب ہمارے پہلے سے زیادہ دوست ہیں۔ مگر جائے پائی نہیں، دانے پانی والے، جن میں گھر کے کتے بلی سے لے کر بال بچے تک سب ہی شامل ہیں اور جن کے ساتھ اب ہم اپنے گھر میں ٹھاٹھ سے رہتے ہیں۔

وقت کاٹنا

کبھی آپ نے کسی کا انتظار کیا ہے؟"

آنے والا نہ آئے تو آپ آنے والے کے انتظار میں، تصویر درد بنے ریشہ خطمی ہوئے جارہے ہوں۔ گھڑی گھڑی باہر دیکھا جارہا ہو، گھڑی گھڑی، گھڑی دیکھی جا رہی ہو، گلی کے پھیرے لگائے جارہے ہوں۔ ہر آنے جانے والے پر گمان ہوتا کہ کہیں، یہ وہی تو نہیں؟ غرض آپ کہیں، خیال کہیں اور ذہن کہیں، گنگناتے ملے جارہے ہوں ؎

آئے گا! آئے گا!! آنے والا آئے گا!!!

آئے گا!

آئے گا!!

آئے گا!!! ...

"اور اس آئے گا، آئے گا"! کی بے ہنگم تکرار کے ساتھ آپ کی کیفیت، کہیں پہ نگاہیں کہیں پہ نشانہ والی ہو گی، دل ہی دل میں "تُو آن کے بس آ ہی جانے کی گھٹا گھٹ دعائیں مانگی جا رہی ہوں گی۔ کبھی اپنے اوپر کھسیا کھسیا کے رہ جاتے ہوں گے ۔ میں آپ ہی آپ ہنسنے کی وجہ سے کھسیاہٹ، جھلاہٹ میں بدلتی جاتی ہو گی۔ انتظار شروع کرنے سے قبل شاید آپ نے کپڑے بھی بدلے ہوں اور کچھ زنانہ یا مردانہ میک اپ بھی کیا ہو گا۔ مگر اب نوبت منہ نوچنے اور گریبان چاک کرنے تک پہونچ چکی ہو گی ۔ تجربہ ہے۔ ایسے میں اگر کوئی ٹوک یا چھینک دے تو بآسانی نوبت تو تکار سے ہاتھا پائی تک پہونچ سکتی ہے۔

لیکن یہ سب تو بعد کی باتیں ہیں فی الحال تو آپ دل ہی دل میں بڑبڑا رہے ہیں" ہونہہ! ارے بھئی، جب نہیں آنا تھا تو وعدہ ہی کیوں کیا تھا۔ کس نے گلے پر چھری رکھی تھی؟ ... بھئی کہہ دیتے کہ نہیں آئیں گے۔ کسی سے کہلوا دیتے ... فون کر دیتے"!

غرض وہ آ ہی نہیں چکتے اور یہاں انتظار میں حالت پتلی ہوتی جا رہی ہے۔ کھڑے کھڑے تختہ یا بیٹھے بیٹھے کلفی ہوئے جا رہے ہیں، یا پھر جہاں تھے وہیں پتھر ہو چکے ہیں ۔ مگر آنے والا گویا نہ آنے کی قسم کھا چکا ہے۔ یا اپنی جگہ طے کر چکا ہے کہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو جائے

وعدۂ وصل نہ پورا ہونے پر دل میں ، سو سو طرح کے ہول اُٹھ رہے ہیں ۔ لیکن اگر آنے والا آپ کا محبوب نہیں بلکہ محض دوست یا ملاقاتی ہے اور اس سے آپ کا کوئی بہت ہی ضروری کام اٹکا ہوا ہے یا وہ کوئی زبردست خوش خبری یا بد خبری لانے والا ہو مگر آ نہیں رہا ہے ۔ اب آپ کا بس نہیں چلتا ۔ انتظار کے ساتھ اس صورت میں غصہ بھی آسکتا ہے جبکہ آپ اس کے آجانے کی صورت میں اُس سے ، اس کے بجائے دھول دھپا بھی کرنے کی حیثیت میں ہوں ۔ اور ممکن ہے . . . . کے بعد آپ "بھاڑ میں جاؤ " کہہ کر خود ہی کسی اور کام سے چلے جائیں ۔

لیکن بجائے کسی کے آنے کا انتظار کرنے سے اگر کوئی بور بن بلائے آن دھمکے تو پھر آپ کا حشر اس سے بھی برا ہو گا ۔ ابھی تک آپ کو کسی کے آنے کا انتظار تھا تو اب آپ کو ان حضرات کے جلد از جلد دفعان ہو جانے کا انتظار بھی رہے گا ۔

بور بھی پھر نہ جانے کس بائے کا ہو ، اپنی لچھے دار اور قطعی غیر متعلق باتوں سے بور کرنے والا محض آپ پر رعب ڈالنے کے لئے شیخی بگھارنے کے سلسلے میں ایک دفعہ بھی بھولے سے سچ نہ بولے ۔ اس بے وقوف کی شہنائی سنتے وقت آپ کی حالت اس تتلی کی سی ہو گی جو چڑیوں پر گھات لگا کر بیٹھتی ہے کہ کب ان کی بات ختم ہو اور آپ اُن کو کسی بہانے سے رخصت کر کے سر درد کی دوا کا انتظام کریں ۔

دوسرے بن بلائے وہ بزرگ ہوتے ہیں جو آپ کے والد یا چچا کے لنگوٹیے ہونے کے ساتھ آپ کی بھی خیر خبر رکھتے ہیں۔ آپ کو منھ لگانا پسند نہیں کرتے، اس قسم کے خود ساختہ بزرگ آتے ہی ایک آدھ دعا یا گھرکی دے کر کرسی پر پاؤں کی جگالی، یا اخبار بینی شروع کر دیتے ہیں اور آپ مجبوراً ان کے سامنے مؤدب بیٹھے، دل ہی دل میں جانے کی دعائیں مانگتے ہیں۔ مگر دل ہی دل میں پیچ و تاب کھانے کے باوجود مسکراتے رہتے ہیں۔

انہی میں وہ چچا چھکن قسم کے بزرگ بھی ہوتے ہیں، جو کسی کا انتظار کرنے کے لیے آپ کے پاس آجائیں گے۔ نہ کبھی آپ کی سنیں گے نہ آپ کو کچھ کرنے دیں گے۔ ممکن ہے کہ دو گھنٹے میں ایک نامکمل لطیفہ سنائیں۔ خواہ ان کی بات سے لطیفے کا کوئی تعلق نہ ہو۔ پھر بیچ میں اس لئے لطیفہ ادھورا چھوڑ دیں گے کہ وہ جن صاحب کا انتظار کر رہے تھے وہ آگئے۔ ممکن ہو سنانے کے بجائے خراٹے شروع کر دیں۔ لطیفہ مکمل نہ ہونے کی وجہ سے کل پھر آنے کی دھمکی دیں گے۔ ممکن ہو۔ اگلے دن ان کے آنے کے ڈر سے آپ دن بھر گھر کا رخ نہ کریں۔

ہمارے ایک دوست کا وقت اس لیے کاٹے نہیں کٹتا کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ زندگی کے دن کس طرح پورے کیے جائیں۔ لہٰذا دفتر سے واپسی پر رات گئے تک ایک پنواڑی کی دکان کا کھاتہ درست کرتے رہتے ہیں۔ اس کے بعد وہ اس انتظار میں کہ نیند آئے تو گھر

پیتوں۔ دو ٹن کے وقت بدلتے رہتے ہیں۔ اگر آپ اُن کے ساتھ چائے پینے پر رضامند ہو جائیں تو وہ چاہیں گے۔ ایک پیالی چائے پر اُن کے ساتھ کسی ہوٹل میں پورا دن یا پوری رات کاٹ دیں۔

لیکن اگر معاملہ کسی انٹرویو کا ہو تو بس پھر آپ ہیں کہ منتظر ہیں۔ مگر آپ کی باری آہی نہیں چکتی، یہاں تک کہ آپ کو تعجب ہونے لگتا ہے انٹرویو میں آنے والوں کے لیے بیٹھنے، لیٹنے اور جاں بحق ہونے کے لیے چارپائی کا انتظام کیوں نہیں کیا جاتا۔

خیر محبوب اور ملازمت سے زیادہ مشکل سے موسم کا مزاج ملتا ہے جاڑے میں تو گرمی آنے کا نام نہیں لیتی۔ گرمی میں تو برسات کا انتظار ہے۔ کسی موسم میں بھی اگلے موسم کے بغیر وقت نہ کاٹے کٹتا ہے اور نہ خیال کی رفتار سے موسم بدلتا ہے۔ مگر اس موسمی دھوپ میں زندگی ضرور گزر جاتی ہے۔

جب امتحان کا نتیجہ نکلتا ہے تو وقت کاٹے نہ کٹنے کے سین دکھائی دیتے ہیں فرسٹ آنے والے بے خبر سوتے ہیں اور تھرڈ آنے یا فیل ہونے والے راتوں کی نیند حرام کیے بھاگتے پھرتے ہیں۔ اور تھرتھراتے کانپتے ہاتھوں سے اپنا نتیجہ دیکھتے ہیں۔ نام یا رول نمبر تلاش کرنے کے دوران جسم پر لرزہ طاری ہوتا ہے۔ اس ایک لمحے میں اُن کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ پاس ہیں یا فیل۔ اگر کسی نے پاس یا فیل کا نعرہ لگا دیا تو مارے خوشی کے اچھل پڑے۔ ہائے کہہ کر بے ہوش ہو گئے۔

زندگی ایک امتحان ہے۔ جس کا فائنل اُس وقت ہوتا ہے جب دولہا دولھن کے حجلۂ عروسی میں داخل ہوتا ہے۔ اس وقت آسانی سے فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ ان دونوں میں کون زیادہ نروس ہے تکلف سے، تکلّم سے اور شرم و حیا سے اطمینان و بے باکی تک کی مختصر ترین منزل طے کرنا قیامت ہے۔

نروس ہونے پر یاد آیا کہ زندگی میں ایسے نازک موڑ بھی آتے ہیں جب وقت کاٹے نہیں کٹتا۔ مثلاً آپ محبوب سے ملاقات کے انتہائی خفیہ مشن پر ہوں، عین دو بڑوں کی چوٹی کانفرنس کے دوران انکے "ابّا جان" اپنی چھڑی یا امی جان اپنی جوتی تلاش کرتی ہوئی ہیو نخ پر سجائیں تو آپ کے لیے چارپائی کے نیچے چھپ جانے کے سوا کوئی چارۂ کار نہ ہوگا۔ والدین ہیں کہ ہٹنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ آپ سانس اور کھانسی روکے رفع شر کی خاطر اپنی خیر منا رہے ہیں۔ خیر آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری میں سانس بھی لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ مگر کھانسنے سے تو یہ اچھا ہوگا کہ ملزم خود اپنے آپ کو تھانے یا عدالت میں پیش کر دے۔ لیکن اس احتیاط کے باوجود اگر صاحبِ خانہ کا کتا مالک کے پیچھے دم ہلاتا ہوا آجائے تو پھر فوراً اُس کے دونوں کان اور نتھنے کھڑے ہو جائیں گے اور اس کی ٹانگ سے لینے سے جو آپ کو بچائے گا بعد میں پھر وہی آپ کی جان بھی لے گا۔ اگر کوئی بچہ گیند کی تلاش میں آئے تو وہ ضرور اس "ہوا" کو دیکھ کر ڈر جائے گا۔ اور اگر نوکرانی ڈی کٹر نے

کے لئے زمین پر آ کر بیٹھے گی تو آپ کا بھوت دیکھنے کے بعد چیخ مار کر بیہوش ہو جائے گی۔

لیکن اگر عارضۂ دل نہ ہو، بلکہ واقعی آپ بیمار پڑ گئے ہوں اور کسی ایسے حکیم یا ڈاکٹر کے پاس چلے جائیں جو اگر آپ کی نبض پر ہاتھ رکھ دے یا اس کا ہاتھ غلطی سے چھو جائے تو آپ بھلے چنگے ہو جائیں یا پھر مریضوں کی بھیڑ بھاڑ میں آپ کی باری اتنی دیر میں آئے گی کہ اگر آپ واقعی بیمار ہیں تو آپ کا بآسانی انتقال ہو سکتا ہے۔ اور اگر کسی اور کی دوا لینے گئے ہیں تو خود اپنا بھی علاج کرانا ہوگا۔

سب سے زیادہ نازک وقت تو خیر وہ ہوتا ہے جب آپ اچانک رفع حاجت کرنا چاہیں اور حسنِ اتفاق سے وہاں کوئی مستقل مزاجی کے ساتھ ڈٹا ہوا "ہونہہ .... ہونہہ" کر رہا ہو اب لاکھ آپ پہلو بدل کر اول فول بکیں مگر وہ بھلا آدمی یوں آسانی [illegible] آپ کی سننے کا۔

وقت کاٹنے نہ کاٹنے کی ایک صورت یہ بھی ہوتی ہے جب آپ کے کان تار والے کی خوفناک آواز سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ اس آواز میں وہ جادو ہے کہ ہر سننے والا اس کو ندا کی جانب بے اختیار "یا اخی" کہہ کر بھاگتا ہے۔

عجب گھبراہٹ ہوتی ہے۔ خدا جانے کیا ہو؟ خدا ہی خیر کرے اس آواز سے لے کر لرزتے ہوئے ہاتھوں سے تار چھیننے پھاڑتے اور

دستخط کرنے سے ان حروف کو پڑھنے تک جو زگاہ سامنے ٹکنے کا نام تک نہیں لیتے کبھی تار والے کے بتانے کے باوجود، وہ نمبر نہیں دکھائی دیتا جس پر دستخط کرنا ہوتے ہیں۔ مجبوراً تار اور کسی کو دیا جاتا ہے "بھئی پڑھو! کیا لکھا ہے میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے!"
غالباً ملک الموت کے بعد تار کی آمد سب سے زیادہ قیامت ڈھاتی ہے۔ موت برحق ہے مگر صرف ایک بار آتی ہے۔ مگر یہ کم بخت بار بار آتا ہے اور ہر بار ادھ مرا کر جاتا ہے اور اس کے آنے کے بعد واقعی پھر وقت کاٹے نہیں کٹتا!۔

میری زندگی کا ایک مزاحیہ پہلو۔

میری زندگی کا ایک مزاحیہ پہلو میری شہرت ہے۔ عام طور پر ہر مشہور آدمی کے بارے میں لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ "مشہور آدمی جو چاہے کر سکتا ہے۔ اس پر دنیا کا کوئی قاعدہ قانون لاگو نہیں ہوتا اور نہ ضرور اس کے قبضے میں الہ الدین کا جادوئی چراغ ہے۔"

تو جناب لوگوں کو پکا یقین ہے کہ ضرور میرے پاس کوئی جادو کا چراغ ہے یا جنات تابع ہیں۔" اسی وجہ سے جان پہچان کے لوگوں کی بات تو جانے دیجئے۔ وہ لوگ جن کو میں جانتا تک نہیں ان کی بھی لائن ڈوری لگی رہتی ہے۔ جس کی وجہ سے میرا ملاقاتی کمرہ اچھا خاصا کسی حکیم یا ڈاکٹر کا جماجما یا مطب معلوم ہوتا ہے

آنے والے بھی بھانت بھانت کے ہوتے ہیں۔ کسی کی بکری کھو گئی ہو

تو وہ بھی چلا آ رہا ہے گویا ہمارا گھر نہ ہوا کانجی ہاؤس ہو گیا۔ محلے کے کسی شاعر نے رات بھر میں غزل کہہ لی تو اس کو سنانے اور چھپوانے کے لئے ڈٹا ہوا ہے۔ اگر محلے کے کسی آوارہ گرد کو پولس نے ٹوک دیا تو وہ بھی کپتان صاحب سے سفارش کروانے کے لئے راشن کارڈ کے لئے ہم سے اس طرح منت سماجت کر رہا ہے گویا ہم سپلائی افسر ہیں اگر شہر میں کوئی ادیب آنے والا ہے یا کوئی جلسہ جلوس ہونے والا ہے تو ادیب کے قیام و طعام سے لے کر اس کا قصیدہ پڑھنے یا تعارفی تقریر کرنے کے لئے ہم کو اس طرح گھیرا جاتا ہے۔ گویا بس اب شہر میں ہم ہی سب سے فالتو رہ گئے ہیں۔

خیر یہاں تک تو غنیمت ہے۔ مگر ستم یہ ہے کہ ہر آنے والا اپنے ساتھ ایک نہ ایک فرمائش بھی لاتا ہے مصیبت یہ ہے کہ ایک تو میں فطرتاً بزدل واقع ہوا ہوں دوسرے میرے مزاج میں بلا کی مروت ہے نتیجے کے طور پر کسی سے انکار کی ہمت نہیں پڑتی۔ دوسرے آنے والے سے انکار کا نتیجہ ہمیشہ اس لیے صفر نکلتا ہے کہ وہ اسے میری انکساری سمجھ کر اس قدر اصرار کرتا ہے کہ میرے لیے اس کی ہاں میں ہاں ملانے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ جاتا۔

آنے والے یا تو اپنے ساتھ کوئی سفارشی خط لاتے ہیں یا آتے ہی اپنا رشتہ سمجھاتے ہیں کہ " میں آپ کے ساڑھو کے نندوئی کے نانا کے چچا کے پرپوتے کا سگا بھانجہ ہوں۔" اس قسم کے لکڑدادا

کے پرنواسے والے رشتے تو آج تک ہماری بھی خاک سمجھ میں نہیں آتے، مگر ایسے موقع پر ذرا سا چوک جانے میں خاندان میں عام رسوائی کے خطرہ کے تحت رشتہ تسلیم کر لینے کے سوا، کوئی چارہ بھی نہیں ہوتا۔ دوسرے وہ لوگ ہوتے ہیں جو ماضی میں ہمارے پڑوسی مالک مکان یا کرایہ دار رہ چکے ہیں۔ تیسرے وہ بے تکلف حضرات ہوتے ہیں جو ہمیں اپنا پرانا ہم سبق، ہم مکتب یا کلاس فیلو بتاتے ہیں۔ چوتھے وہ پرستار ہوتے ہیں جو ہمیشہ اس حوالے سے ملتے ہیں کہ ہم آپ کو اب تک پڑھتے رہے ہیں یا ہم نے آپ کی فلاں فلاں چیز فلاں رسالے، اخبار یا کتاب میں فلاں سن میں پڑھی تھی ۔ اس کے بعد ایسے تعریفوں کے پل باندھتے ہیں کہ ہم مارے خوشی کے پھول کے کپا ہو جاتے ہیں۔

ہر آنے والا نہ صرف اپنے مطلب سے آتا ہے بلکہ اس کی بھی پوری توقع رکھتا ہے کہ نہ صرف ہم اس کی ناشتے اور کھانے سے تواضع کریں گے بلکہ اس کو شہر کی مفت سیر کروانے کے بعد کافی ہاؤس اور سینما بھی لے جائیں گے اور مہمان خانے سے مفتوں اس کا بستر نہ بندھنے دیں گے ۔ اس کے علاوہ یہ اپنے جس سرکاری یا غیر سرکاری کام سے جائے گا ۔ سفارش کے لیے ہم ضرور اس کے پیچھے زمین کا گز بنے رہیں گے ۔

اگر آنے والا آس پاس کا قصباتی شاعر یا ادیب ہے تو وہ

شرف مہمانی بخشنے کے ساتھ ساتھ نہ صرف یہ چاہے گا کہ ہم اس کے اعزاز میں ردا نہ ادبی نشستیں کریں بلکہ ادبی دنیا کی تازہ ترین صورت حال سے بھی اس کو آگاہ کریں اور چلتے وقت وہ بلا مانگے جو رسالے کتابیں اپنے پورٹ فولیو میں رکھ لے اس پر اس کو نہ صرف مبارکباد دیں بلکہ ابھی سے فرمائش کریں گے کہ "ہماری لائبریری کو اپنی لائبریری سمجھتے ہوئے اُن کو لے جانے کے لیئے ایک تھیلہ بھی لے آتے۔"

ایسے ہی ایک صاحب ۲ بجے رات کو وارد ہوئے انھوں نے پھاٹک پر اس قدر ہاکنگ کی کہ مجبوراً ہمیں سوتے سے اٹھ کر جانا پڑا۔ انھوں نے ہمیں فرشی سلام کے بعد بتایا کہ "آپ کے ہوتے ہوئے بھی شہر میں کس قدر اندھیر ہو رہا ہے۔ میں سینما دیکھ کر آرہا تھا کہ فلاں داروغہ نے ٹوک دیا۔ اگر سینما کا ادھا نہ دکھاتا تو ضرور آوارہ گردی کے جرم میں حوالات میں بند کر دیتا۔" ان کی رام کہانی سننے کے بعد بناوٹی غصّے کے ساتھ کہا۔ "اچھا اس کی یہ ہمت؟" انھوں نے گڑ گڑا کر کہا۔ "آپ کپتان صاحب سے کہہ کر اس کا تبادلہ کروا دیجئے؟"

اس کے بعد وہ ہمیں بہت سی دعائیں دیتے ہوئے چل دیے۔ اور ہم اس واقعے کو بھول بھی گئے۔

ایک دن وہ مٹھائی سے لدے پھندے آئے اور ہمارا شکریہ ادا کیا کہ آپ کے ذرا سے اشارے پر داروغہ کا تبادلہ ہو گیا۔ ہمیں

اس دار وغیرہ یا اس کے تبادلے کے بارے میں کوئی علم نہ تھا۔ مگر اس کے باوجود ہم مسکرائے۔

ایک صاحب جنھوں نے آتے ہی گلے لگا لیا اور کہا، "آپ بڑے آدمی ہو گئے تو کیا ہوا ہیں تو ہمارے پرانے لنگوٹئے یاد ہے ہم تم پارک میں گلی ڈنڈا کھیلا کرتے تھے۔"

اس تمہید کے بعد انھوں نے ہماری سگرٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ تمھارا بھتیجہ دسویں کے امتحان میں بیٹھا ہے اور تو سب پرچے اچھے ہو گئے مگر حساب کا پرچہ ٹھیک نہیں ہوا ہے۔"

ہم نے اس کا رول نمبر نوٹ کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہو جائے گا۔"

وہ چلے گئے اور رول نمبر والا کاغذ ہم نے بہت اطمینان سے ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ ایک مہینے کے بعد ہمارے لنگوٹیے یار اپنے صاحبزادے کے ساتھ ہمارا شکریہ ادا کرنے آئے۔ ہم نے نصیحت کے انداز میں اپنے بھتیجے کو گھور کر دیکھا اور ڈپٹ کر کہا۔ "کیوں میاں صاحبزادے اس طرح حساب کا پرچہ گوڑا جاتا ہے۔ اب ہر سال تو میں جناب کی سفارش کرنے سے رہا۔ وہ تو کہئے میں نے اپنے ہاتھ سے چار کو چالیس بنایا ورنہ بری طرح فیل تھے ایک تو کاپی میں اتنی کاٹ پیٹ اور پھر ایک دم سادی کاپی چھوڑ دی۔" لڑکے نے مجرموں کی طرح سر نیچا کر کے آئندہ محنت سے پڑھنے کا وعدہ کیا۔ وہ تو

کھئے ہیں بیچ میں پڑ گیا ورنہ میرا لنگوٹیا تو وہیں اپنے محنت جگری کی کھال کھینچنے پر تیار ہو گیا۔

ایک صاحب ایک دن صبح صبح میرے پاس تشریف لائے اور بولے۔

"آپ کو لوگ بمبئی میں ضرور جانتے ہوں گے؟"

میں نے کہا "جانتے ہیں۔"

وہ بولے:-

"میرا لڑکا فلم میں ہیرو بننے کے شوق میں بمبئی بھاگ گیا۔ آپ فلم والوں کو لکھ دیں کہ اُسے ہیرو بنانے کے بجائے میرے پاس واپس بھیج دیں۔ میں نے کہا۔

"ایسا ہی ہو گا۔"

ایک ہفتے کے بعد وہ صاحب شکریہ ادا کرنے آئے اور بولے۔

"اگر آپ واپسی کے لئے نہ لکھتے تو میرا ایک ہی لڑکا ہے، میں کہیں کا بھی نہ رہتا۔"

اور میں حیرت سے ان دونوں کا منہ دیکھتا اور مسکراتا رہا۔

ایک پبلشر صاحب کلکتے سے آئے اور بولے۔

"ہم آپ کی خاطر اتنی دور سے آئے ہیں۔ ہمیں بھی اپنی کوئی کتاب چھاپنے کے لیے دیدیجئے۔" ہم نے کہا۔

"کتاب تو کوئی نہیں ہے۔"

گڑگڑا کر بولے۔

"رات بھر میں لکھ دیجیے۔ منھ مانگے پیسے دیں گے۔"

پیسوں کا نام سن کر ہم نے حامی بھر لی اُن کے جانے کے بعد ہم بے خبر سو گئے۔ صبح وہ آئے اور بولے:

"ہماری کتاب لائیے"

ہم نے انھیں اپنی ایک پرانی کتاب کا مسودہ دے دیا۔ بس تب ہی سے وہ جس سے بھی ملتے ہیں ہماری بے حد تعریفیں کرتے ہیں کہ ہم نے رات بھر میں کتاب لکھ دی۔ وہ صرف یہی نہیں کہتے بلکہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ اُن کے سامنے بیٹھ کر کتاب لکھی۔

خیر رسالے، اخبار، ریڈیو اور کتابوں والے تو لکھنے کا یہی مطلب سمجھتے ہیں۔ کہ ادھر کہا اُدھر لکھا۔ گویا ہم لکھنے کی مشین ہیں کہ ادھر بٹن دبایا ادھر کھٹ سے مزاحیہ نکل آیا۔

لیکن زیادہ تر تو وہ لوگ ہیں جو روزانہ آکر ہمیں کوئی نہ کوئی بہت ہی غیر اہم اور غیر دلچسپ واقعہ سنانے سے زیادہ اس پر ہنستے ہیں اور پھر اصرار کرتے ہیں کہ "اس پر بھی کچھ لکھیے"۔

ایک صاحب کو کہیں سے کچھوے کا انڈا مل گیا۔ انھوں نے کئی دن ہمارے گھر کے چکّر لگائے کہ ہم اس واقعہ پر ضرور کچھ نہ کچھ لکھیں۔

ایک صاحب کو سڑک پر ایک خالی پرس پڑا مل گیا وہ بہ ضد ہیں کہ اس پر کچھ لکھا جائے۔ ایک صاحب کا دعویٰ ہے کہ جس دن سے انکی

شادی ہوئی ہے تب سے آج تک روزانہ ان کی بیوی اُن سے لڑتی ہیں وہ چاہتے ہیں کہ میں اس آئے دن کی لڑائی پر لکھ دوں تو اُن کی گھریلو زندگی سدھر جائے۔

غرض صاحب میرے پاس بھانت بھانت کے لوگ اپنی عجیب و غریب فرمائشوں کے ساتھ آتے ہیں۔ جن کو دیکھ کر کم از کم یہ ضرور میری سمجھ میں آنے لگا ہے کہ لوگ بیمار ہونے کے بعد بجائے دوا علاج کے ٹونے ٹوٹکے کیوں کرواتے ہیں اور اچھے بھی ہو جاتے ہیں۔ مجھے لوگوں کے آنے پر غصہ نہیں آتا مگر اس بات پر ضرور ہنسی آتی ہے کہ بلا میرے ہاتھ پاؤں ہلائے یا زبان کھولے اُن کے کام ہو جاتے ہیں۔

بھولنے کی عادت

بھولنے کی عادت بُری نہیں، بشرطیکہ اس کمزوری سے آپ کے احباب اور خدمت گار واقف ہو جائیں۔ میری کمزوری یہ ہے کہ میں بات بھول جاتا ہوں، جس کی وجہ سے ہمیشہ میری صحت اچھی اور دوسروں سے تعلقات خراب رہتے ہیں۔

صحت اس لیے اچھی رہتی ہے کہ بری باتیں اور پریشان کن خبریں "یادداشت" کی نذر ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا دماغ پُرسکون اور ذہن صاف رہتا ہے اعصاب پر بار نہ پڑنے کی وجہ سے طبیعت بشاش رہتی ہے۔ اور بآسانی بڑی سے بڑی مصیبت سر سے گزر جاتی ہے۔

تعلقات کی خرابی کا سبب ظاہر ہے کہ کسی کا ضروری سے ضروری کام ہو، خود بھی دل مدد کے لیے آمادہ ہو، اور اس خوف سے وہ کہیں بھول

نہ جائیں اس ضروری کام کو ڈائری میں نوٹ بھی کر چکے ہوں، اگر اب
اس کو کیا کریں کہ ڈھونڈنے سے ڈائری بھی نہ ملے اور اگر مل جائے تو
پھر یہ یاد نہ آئے کہ اس میں آخر لکھا گیا ہے ۔ یا وہ بات کس ڈائری
میں لکھی تھی ۔ ۔ ؟

اس سے زیادہ پر لطف مصیبت اور مضحکہ خیز صورت حال کا اس وقت
مقابلہ کرنا ہوتا ہے ۔ جب اپنے کسی دوست سے کسی دوسرے دوست کا
تعارف کرانے کی نوبت آجائے ۔

ظاہر ہے کہ جس شخص کے ساتھ آپ عرصے تک کھاتے، پیتے، گھومتے
اور گپ مارتے دیکھے گئے ۔ اگر سلسلہ تعارف آپ اس سے پوچھ بیٹھیں
کہ "میاں آخر تمہارا نام کیا ہے ؟" تو وہ اپنی اور آپ کی جان ایک
کر دے گا لیکن یہ مشکل آسان یوں ہو گئی کہ جب کبھی اس کی نوبت آجاتی
تو پہلے تو اصرار کرتے ہیں اور انتہائی تعجب کے ساتھ دریافت کرتے ہیں
"ارے ! کیا واقعی آپ ایک دوسرے سے متعارف نہیں ؟" اور
جب نوبت حلف اٹھانے کی آجائے کہ واقعی دونوں ایک دوسرے کو
بالکل نہیں جانتے تو مجبوراً پینترا بدل کر کہتا ہوں ۔

"پھر بہتر ہے کہ آپ دونوں خود ہی ایک دوسرے سے متعارف ہو
جائیں" اس حادثے کے کئی منٹ بعد تک مجھے ان دونوں کے نام زبانی
یاد رہتے ہیں ۔

پہلے مجھے اس سلسلے میں بڑی پریشانی ہوتی تھی کہ خدا جانے وہ کس

بھولکڑی کا کیا انجام ہو۔؟ زندگی میں کچھ کر بھی سکیں گے۔ مگر ایک زمانے میں یہ پریشانی بھی خود بخود دور ہو گئی۔ ہوا یہ کہ ہم نے ایک انگریزی رسالے میں پڑھا کہ دنیا کے بیشتر بڑے آدمیوں کی یادداشت تقریباً نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے“

اپنے سلسلے میں چونکہ ہم کو ہمیشہ کچھ نہ کچھ خوش فہمی رہی کہ ہم ضرور بڑے آدمی ہیں۔ اور اگر ابھی تھوڑا سا نہیں بھی ہیں، تو عنقریب ہو ہی جائیں گے لہذا عیب عیب نہ رہا۔ فخریہ اور اعلانیہ اپنی اس کمی پر ناز کرتے گے۔ کوئی بے تکلف دوست اگر ٹوک بھی دیتا کہ۔

”ارے بھئی! بھولنے کی بھی ایک حد ہوا کرتی ہے۔ غضب خدا کا یہ تک بھول گئے کہ صبح سے تم نے کچھ کھایا بھی ہے یا نہیں؟“

ہم نے اکڑتے ہوئے جواب دیا۔

”جناب ہم کیا۔ دنیا کے زیادہ تر بڑے آدمیوں کا یہی حال ہے“ ”بڑے آدمیوں کو مارئیے گولی۔ بغیر کھائے رہے کیسے؟“

”ہاں کچھ کمزوری تو میں بھی محسوس کر رہا تھا۔ مگر اصلی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی“

”کمال ہے“

”یہ کیا کمال ہے۔ مجھ سے زیادہ حیرت انگیز یادداشت تو بجلی فون کے موجد اڈیسن کی تھی، وہ ایک دفعہ ٹیکس جمع کرنے گیا، گھنٹوں لائن میں کھڑا رہا۔ اور جب اس کا نام پکارا گیا تو وہ اپنا نام بھول گیا اور

اس کے ساتھی نے اسے یاد دلایا کہ "تمھارا نام ایڈیسن ہے" اور اس کے ساتھی نے سر پیٹتے ہوئے بہ دقت تمام اُسے یقین دلانے کی انتہائی کوشش کی۔ مجبوراً ایڈیسن نے اس کا دل رکھنے کے لیے فرض کر لیا کہ اس کا نام ایڈیسن ہے۔ اور جناب انہی صاحب کا ملازم ان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ان کو سوتا دیکھ کر ان کا کھانا یا ناشتہ چٹ کر جاتا تھا اور جھوٹے برتن ان کے سامنے لگا دیتا تھا۔ جب یہ حضرت سو کر اٹھتے تو سمجھتے کہ "میں کھا چکا ہوں" میرا دوست حیرت اور دلچسپی سے سن رہا تھا۔ میں نے اسے مزید بتایا کہ "ایڈیسن کیا مشہور مسخرے چارلی کو تو بڑا آدمی مانو گے۔ سات سال بعد جب اس کا پرائیوٹ سکریٹری اس سے رخصت ہونے لگا تو چارلی کو یہ یاد نہ آیا کہ اس کا نام کیا ہے؟"

ہمارے دوست بولے "بھاڑ میں جائے ایسی بڑائی۔"

ایک دن ہمارے یہی دوست مزے لے لے کر ایک مضمون پڑھ رہے تھے، سب دلچسپی سے سن رہے تھے، مضمون بہت پسند آیا۔

جب مضمون ختم ہو گیا تو میں نے پوچھا "بھائی! یہ اتنا عمدہ مضمون کس کا ہے مجھے بہت پسند آیا" سب لوگ قہقہہ مار کر ہنس دیے اور میں بھی ہنس دیا۔ جب مجھے بتایا گیا کہ "یہ میرا تازہ ترین مضمون ہے، جو میں نے اسی ہفتے لکھ کر ایک رسالے میں اشاعت کے لیے بھیجا تھا"

بھولنے کے بارے میں مجھے اپنے بہت سے لطیفے اس وقت یاد آ رہے

ہیں جو میں نے اکثر اپنے گھر اور دوستوں سے سنے ہیں۔ یادداشت کی حد تک آپ کو بھی سنانے کی کوشش کروں گا۔

بچپن میں ایک بار گھر سے چھپ کر سینما دیکھنے گئے۔ کسی کو پتہ بھی نہ چلا مگر جب سب کھانے کی میز پر جمع ہوئے تو خیال نہیں رہا اور ہم نے سینما کا قصہ سب کو سنانا شروع کر دیا۔ پول کھلنے پر جو بے بھاؤ کے پڑے تو سب "یادداشت" ٹھکانے آگئی۔

ایک دفعہ ہمارے ایک دوست سے ہماری بہت سخت لڑائی ہو گئی۔ دوسرے دن ہم عادتاً ان کے گھر جا پہنچے۔ ہمارے دوست ہماری اس کمزوری سے واقف تھے انھوں نے یاد دلایا کہ "ہماری تمھاری لڑائی ہو چکی ہے" مگر باوجود ان کے یاد دلانے اور اصرار کے ہمیں "لڑائی ہونے کا واقعہ" یاد نہ آیا اور مجبوراً ہمارے دوست کو ہم سے دوستی کرنا ہی پڑی۔

بھولنے کی عادت کی وجہ سے ہمیشہ غیروں سے شرمندگی رہی کہیں عزیزوں میں پھنس گئے اور لگے ہاتھوں تعارف بھی ہو گیا یا کسی نے اشارتاً بتا دیا کہ یہ "تمھارے چچا ہیں"... یا کسی تقریب میں کسی صاحب سے کسی نے ملوا دیا اور دوسری بار ہم یا تو بغیر ان کو لفٹ دیے گزر گئے یا ان سے متعارف ہونے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ "مل چکے ہیں"۔

اب ہم لاکھ کہیں کہ "صاحب! جو خوشی بار بار ملنے میں ہوتی ہے وہ ایک آدھ ملاقات میں کہاں؟"

مگر تو یہ کیجیئے۔ ان باتوں کا اثر تھوڑا ہی ہوتا ہے۔ اور ہوتا بھی ہے تو صرف یہ کہ لوگ خواہ مخواہ غلط رائے قائم کر لیتے ہیں، اسی لیے اکثر ایسی کتابیں پڑھ پڑھ کر بھولتا رہتا ہوں جن میں حافظے کو اکسیر بنانے کے نسخے درج ہوتے ہیں۔

بھولنے کی عادت پر آخر میں ایک بات یاد آگئی کہ .. ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا ۔۔ ؟ ۔

آئینہ دیکھ اپنا سا منھ لے کے رہ گئے

مرزا غالب پر صاحب واقعی کیا قیامت گزر گئی ہو گی جب عشق کے تمام ہتھکنڈے استعمال کرنے کے بعد بھی وہ اپنے بُت پُر غرور کا دل حاصل کرنے میں ناکام رہے ہوں گے۔

یہ دوسری بات ہے کہ جب ان کے محبوب نے آئینے میں اپنی شکل دیکھی اور کلیجہ تھام کر بیٹھ گیا۔

"اُوہ! ہمارے چہرے پر اتنے داغ دھبے مہاسے اور جھائیاں ہیں۔ مرزا لاکھ پیوں کے ہیں مگر صورت چڑیلوں سے بھی بدتر ہے"

لیکن یہ مصرعہ گنگنانے کے بعد ع

آئینہ دیکھ اپنا سا منھ لے کے رہ گئے

ہمیں ہمیشہ یقین ہو جاتا ہے کہ چچا نے ہرگز اپنے محبوب کو ایک بار

غلطی سے بھی دیکھا تھا۔ ورنہ ان کے عاشق ہونے کی نوبت ہی نہ آتی۔ مگر اتنا ہم مانتے ہیں کہ مرزا نے اس کا فوٹو ضرور دیکھا تھا یا کہیں سے پا گئے تھے، اور ہمیشہ اپنی جیب میں رکھتے تھے، اور جب ان کے محبوب نے آئینہ دیکھا تو اپنا سا منھ لے کے رہ گیا۔ اور اس سادے واقعے کی کسی فتنہ پرداز نے پرائیویٹ طور پر مرزا سے رپورٹنگ کر دی۔

فوٹو کی بات میں نے اس لیے کہی کہ صاحب خود میری تصویر کیمرہ فیس ہونے کی وجہ سے بہت ہی زوردار آتی ہے اور جب کبھی کہیں میری فوٹو چھپی چھپائی، فوراً اس کے بارے میں باقاعدہ تفتیش شروع ہو جاتی ہے۔ "ضرورت رشتہ" کے بارے حضرات و خواتین کی گھر میں آمد و رفت شروع ہونے لگتی ہے، ایسے نازک موقعہ پر معاملہ فہم حضرات تو دور ہی سے ایک جھلک دیکھنے کے بعد ایسے نو دو گیارہ ہوتے ہیں کہ ہم کو ان کی ہوا بھی نہیں لگ پاتی، لیکن بعض دوراندیش اور چھوٹے کے گھر تک پہونچنے والے بزرگ آدھمکتے ہیں اور ہم سے طرح طرح کے بے تکے سوالات شروع کر دیتے ہیں۔

"اچھا! تو آپ ہیں؟"

"جی ہاں"

اور یہ فوٹو بھلا کس کا ہے؟ آپ کے چھوٹے بھائی کا تو نہیں ہے؟"

"جی فوٹو تو میرا ہی ہے"

"مگر صاحب اس میں اور آپ میں زمین آسمان کا فرق ہے! آپ تو ہماری آنکھوں میں دھول جھونکنا چاہتے ہیں؟"

"جی کیمرہ فیس اسی کو کہتے ہیں"۔

چوں کہ ہم تصویر سے پہلے اور تصویر کے بعد کی صورت حال سے نپٹنے کے اب عادی ہو چکے ہیں۔ اس لیے اب بے ہوش یا بدحواس ہوتے کی انتہائی خندہ پیشانی سے معاملے کو سلجھاتے اور غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں کبھی اپنی صفائی میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ:۔

"جناب صورت پر نہ جایئے، ہماری سیرت تو دیکھیئے"

"ذرا ایک نظر صحت پر بھی ڈالیئے"

"صورت ہی دنیا میں سب کچھ نہیں ہوا کرتی!"

مگر آخر میں یہ بھیڑ لعنت ملامت کے بعد چھٹ جاتی ہے اور ہم اپنا سا منہ لے کے رہ جانے کے بعد اپنے چہرے کے داغ دھبے دور کرنے کی دوائیں پابندی سے استعمال کرنے اور پلاسٹک سرجری کی مدد سے اپنے چہرے کو نقل مطابق اصل بنانے کے ماہرین سے رجوع کرنے کے بارے میں ایک بار پھر سنجیدگی سے غور کرنے لگتے ہیں۔

لیکن چہرے مہرے پر ہی کیوں جایئے۔ آج کل تو "ملاوٹ" ہیں چاندی ہے۔ لوگ پکڑے جاتے ہیں، سزائیں پاتے ہیں اور چھوٹ آنے کے بعد پھر دودھ میں پانی اور آٹے میں کھریا ملاتے ہیں۔ جب کہ ہم اپنے معاملے میں اس قدر بے قصور ہیں کہ فوٹو کھچوانے سے پہلے میک اپ تک نہیں کرتے۔ اگر فوٹو بناتے وقت فوٹو گرافر ایک آدھ برش لگا کر ہمارے چہرے کے داغ دھبے دور کر دیتا ہے تو ملاوٹ اور اس کا گناہ، اس کے نامۂ اعمال میں جاتا ہے۔ دوسرے جب سے

ہماری تصویر پر لوگ دوڑنے لگے اور ہمیں معلوم ہو گیا کہ اگر ہم بلا منھ دھوئے بھی تصویر کھچوالیں تو ہزاروں میں ایک ہو گی۔ اس وقت سے ہم نے تصویر کھچوانے کا اہتمام بھی ختم کر دیا۔ بلکہ جب کبھی شناختی کارڈ البم، آٹوگراف یا فلمی دوستی کے لیے ہمیں تصویر کی ضرورت ہوتی ہے تو ہم اپنے فوٹوگرافر سے کہتے ہیں کہ ہماری تصویر کی اتنی کاپیاں اور بنا دو۔ اور وہ ہمارے نگیٹو کی مدد سے ہماری تصویر کی مزید کاپیاں بنا دیتا ہے۔

لیکن جب ہماری ایسی ہی کسی تصویر کو دیکھنے کے بعد ایک صاحب نے ہمیں بھی دیکھ کر اتنا پسند کیا جتنا کہ انھوں نے تصویر کو پسند کیا تھا۔ اور اس کے بعد انھوں نے ایک معقول جگہ پر رشتے کی تحریک کی تو وہ ہم نے اس شرط پر منظور کر لی کہ "صاحب معاملہ بھی تصویر کو درمیان میں ڈالے بغیر اگر ہم پسند کر لیں تو ہم ان کی غلامی میں آنے کے لیے ایک سو ایک بار دل و جان سے تیار ہیں"۔

اور صاحب معاملے کی پسندیدگی کے بعد اس شرط پر یہ معاملہ پکا ہو گیا کہ "ہم آئندہ کبھی بھول کر بھی کوئی تصویر نہ کھچوائیں گے۔"

اپنی سلامتی اور مفاد عامہ کے پیش نظر ہم نے ان کی پیش کش دل و جان سے منظور کر لی۔

بس وہ دن ہے اور آج کا دن کہ ہم بھول کر بھی نئی تصویر نہیں کھچواتے اور اگر ہماری کوئی پرانی تصویر دیکھ کر بھولا بھٹکا آنکلتا ہے تو ہم اس سے نہایت اکڑ کر ڈنکے کی چوٹ پر کہتے ہیں:۔

"جی ہاں! یہ ہماری تصویر ہے، اگر یقین نہ آئے تو ہماری بیگم صاحبہ سے

پوچھ لیجئے!"

اور بیگم صاحبہ کا نام سنتے ہی آنے والا ایسا غائب ہوتا ہے، جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔

لیکن کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ آنے والا جانے سے پہلے بکڑا لیا جاتا ہے۔ یعنی بیگم صاحبہ لپک کر اس کو نہ صرف روکتی ہیں بلکہ ایسا آڑے ہاتھوں لیتی ہیں کہ نہ صرف آنے والے پر چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں بلکہ ہم بھی خوشی کے مارے پھولے نہیں سماتے، کیونکہ اس قسم کی خواتین سے وہ اب گن گن کر بدلے لے رہی ہیں جو ہمیں یا ہماری اتنی اچھی تصویر کو کیا کچھ نہ کہہ جاتی تھیں۔ بیگم صاحبہ کی شہ پانے کے بعد ہم بھی اپنے میاں مٹھو بننے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنی تصویر کے ساتھ ساتھ اپنی بھی خوب خوب تعریفیں کیا کرتے ہیں، جس کو آنے والے اس بے بسی سے سنتے ہیں کہ ہمیں اپنی پرانی بے بسی یاد آجاتی ہے۔ پھر ہمیں خود بخود آنے والے پر رحم آجاتا ہے اور ہم معاملہ رفع دفع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

معاملہ تو ہر بار رفع دفع ہو ہی جاتا ہے مگر اس کے باوجود تصویر اور اس کے شائقین کا سلسلہ کسی نہ کسی شکل میں جاری رہتا ہے اور اس سلسلے میں نجات بیگم صاحبہ اس طرح دلاتی ہیں جیسے کہ چوکیدار چور سے۔ جس کی وجہ سے اب آئینہ دیکھنے کے بعد بھی ہمارا بھرم رہ جاتا ہے اور ہم کسی کو دل نہ دینے پر مغرور رہتے ہیں۔

لیکن صاحب اس کے باوجود تصویر دیکھ کر آنے والے حضرات اُن

خواتین سے قطعی مختلف ہوتے ہیں جن سے بیگم بآسانی نپٹ لیا کرتی ہیں۔

اس سلسلے میں ایک مجبوری تو یہ ہوا کرتی ہے کہ بیگم لاکھ آزاد خیال سہی، مگر ہر ایک مرد، بلکہ بقول "مردمے" کے منھ کیسے لگیں۔ دوسرے "مرد معقول" کی تو کوئی بات نہیں مگر بپھرے ہوئے لوگوں کے جن کو کسی حد تک "نامعقول" بھی کہا جاسکتا ہے، منھ بیگم کہاں لگتی پھریں۔ اگر منھ پھٹ سے منھ پھٹ پڑدسن بھی ہو تو وہ اس کی قرار واقعی گوشمالی تک کر سکتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ "غیر" کو یوں آنکھ دکھانا بھی آسان نہیں۔

لیکن ہم نے ایسے لوگوں کا بھی علاج دریافت کر لیا ہے کہ جیسے ہی کوئی صاحب ہماری تصویر پر قربان ہوتے ہوئے بالکل رابطہ خطمی ہو کر ہمارے پاس آتے ہیں۔ اور یہ معلوم ہونے کے بعد کہ جن صاحب کی تصویر ان کے ہاتھ میں ہے وہ بھی حقیر پرتقصیر ہے۔ ایک دم جنگلی بلّے کی طرح پھول کر غرانے والے ہوتے ہیں کہ میں اپنا فیملی البم ان کے آگے بڑھا دیتا ہوں کہ "صاحب یہ تصویر کیا، ایک سے ایک تصویریں دیکھیے"۔

اور جب وہ ہماری اور ہماری بیگم کی انواع واقسام کے نیم　　نی پوز میں دیکھتے ہیں تو کھٹ سے ان کا سارا غصّہ سوڈے کے ابال کی طرح غائب ہو جاتا ہے۔ اور وہ ہمیں خوش و آباد رہنے اور پھلنے پھولنے کی دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہو جاتے ہیں۔

بن بلائے مہمان

آئے دن کے بن بلائے مہمانوں نے تو صاحب میرا ناطقہ بند کر رکھا ہے کبھی کبھی تو اتنا عاجز ہو جاتا ہوں کہ جی چاہتا ہے کہ گھر انہی عذاب جان مہمانوں پر چھوڑ کر کسی ملاقاتی یا عزیز کے یہاں مہمان چلا جاؤں، تاکہ انہیں بھی کچھ دن تک آٹے دال کا بھاؤ یاد رہے۔ یا ایسا گھر بساؤں کہ بقول غالب ہمسایہ کوئی نہ ہو۔ پر کروں بھی تو کیا، میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا ایک دن کی بات ہو تو رونے پیٹنے کے ریہرسل کے بعد صبر بھی کیا جا سکتا ہے۔ مگر یہ تو شیطان کی آنت والا سلسلہ ہے جو ختم ہونے میں نہیں آتا۔ اور اس چکر میں میرا اچھا خاصہ دولت خانہ۔ غریب خانہ سے بھی بدتر ہو کر رہ گیا ہے۔

غرض صاحب، سخت نروس ہوں، شاید ہی کوئی منحوس دن جاتا ہو

جب آسمان سے ایک نہ ایک مہمان نہ ٹپکتا ہو۔ اگر آج ججی جان صاحبہ مع اپنے نصف درجن جگر کے ٹکڑوں کے دوا علاج اور تعلیم وغیرہ کے سلسلے میں چلی آرہی ہیں تو کل جناب خالو جان مع اپنی پوری سسرال کے لکھنؤ گھومنے چلے آرہے ہیں، ہمارے یہاں یہ بزرگ یوں تو کبھی خیریت کا خط تک نہیں لکھتے، نہ شادی غمی میں جھوٹے منہ پوچھتے ہیں دراصل ڈرتے ہیں کہ کہیں سچ مچ نہ نازل ہو جائیں۔ مگر آنے کے بعد سے ہر قسم کے حقوق جتائے اور نبھائے جا رہے ہیں۔ خون کا رشتہ حقے کی طرح بار بار تازہ کیا جا رہا ہے مگر میں بھی خوب سمجھتا ہوں کہ بزرگوار سرکاری کام سے آئے ہیں جس کا سفر خرچ اور بھتہ ان کی جیب میں محفوظ ہو رہا ہے۔ مگر چاند مجھ غریب کی ٹھک رہی ہے۔

انھوں نے آتے ہی ایک بیان جاری کر دیا کہ "بچے قادم پر رہتے رہتے جنگلی ہوئے جا رہے تھے۔ اس لیے اُن کو شہر کی ہوا کھلانی ضروری تھی۔" مگر ان سے کون کہے کہ بابا لوگوں کی ہوا خوری کے ساتھ ساتھ اب برسوں تو دوا علاج کا سلسلہ جاری رہے گا۔ پھر بچوں کی تعلیم کا، مطلب یہ ہوا کہ سالہا سال کی فرصت۔ مگر سب کچھ جاننے اور سمجھنے کے باوجود منہ سے اف اس خوف سے نہیں کی جا سکتی کہ خاندان بھر میں بعد میں نکّو کون بنے۔

ایمان کی بات تو یہ ہے کہ ایک دن کا مہمان ایک دن کا سلطان ہوتا ہے، مگر دوسرے دن شیطان اور تیسرے دن بے ایمان سمجھا جاتا ہے، اس کے بعد اس کا شمار باقاعدہ حرام خوروں میں ہونے لگتا ہے، مگر یہ سب

باتیں تو سمجھ داروں کے لیے ہوا کرتی ہیں ورنہ بقول بیگم صاحبہ "یہ بات ان سے ڈھکی چھپی نہیں کہ نہ میں بڑے باپ کی بیٹی ہوں۔ نہ جہیز میں اپنے ساتھ قارون کا خزانہ لائی ہوں، کالج میں پڑھانے والی استانی کی بساط ہی کیا۔ لاکھ شوہر صاحب دفتر میں ملازم ہوں، مگر آمدنی تو بالکل بنی تلی اور بندھی ہوئی ہو۔ البتہ ہاتھ روک کر سلیقے سے خرچ کرنے کی وجہ سے ہمیشہ میرے ہاتھ میں کچھ نہ کچھ پیسہ ضرور رہتا ہے۔ دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت نہیں پڑتی، مگر خطا یہ ہے کہ ضرورت سے زیادہ با مروّت اور خوش اخلاق واقع ہوئی ہوں، دوسرے میرا مکان بالکل شہر کے بیچ میں ہے جہاں سے دفتر، اسکول، اسپتال، بازار اور قبرستان وغیرہ بالکل قریب ہیں، گھر بھی خاصہ کشادہ واقع ہوا ہے جو کبھی گھر ضرور معلوم ہوتا تھا، مگر اب میزبانی کی اس منزل پر پہونچ چکا ہے جہاں گھر، سرائے اور گھر والے اس کے ملازم معلوم ہوتے ہیں۔ جن کا کام آنے والوں کی تواضع، ان کے آرام کا خیال اور ان کو بھگتنے کے سوا کچھ بھی نہیں، خاکساری برتتے برتتے بال سفید ہو چکے ہیں، صحت جواب دے چکی ہے۔ اندوختہ ختم ہو گیا ہے، گرہستی بگڑ چکی ہے۔ شوہر ناراض اور بچے پریشان رہتے ہیں"

بہ حیثیت میزبان کے میرے ذمّے فرائض کی پابندی اور خدمت گاری ہے، اور مہمان صاحبان، مہمان نوازی کے خود ساختہ حقوق سے برسا برس تک بغیر فرض کی ادائیگی کے فائدے اٹھاتے رہنے کے دم خم رکھتے ہیں۔

مہمان اگر صبح سویرے نازل ہونے کا نوٹس دیں تو پھر اس کا مطلب یہ ہوا کرتا ہے کہ بیگم صاحبہ ان کے استقبال کے لیے سارا گھر ٹھیک کریں۔ میز پوش، گلدان، پردے، تکیے کے غلاف بدلیں، بچوں کو ٹھیک کریں۔ اور پکوان پکانے کے بعد مہمانوں کے انتظار میں پان لگا کر، سر دنہ لے کر اس وقت تک کے لیے ڈلی کترنے بیٹھ جائیں جب تک وہ نہ آئیں۔ خواہ وہ اگلے دو دن تک نہ آئیں اور گھر والے اسٹیشن سے لوٹ کر بطور انعام اپنے گھر میں مہمانوں والا کھانا کھائیں۔

ظاہر ہے کہ اگر ماموں جان مع موہانی کے صبح آٹھ بجے چائے پر تشریف لانے والے ہوں تو بھلا بارہ بجے سے پہلے کیا آئیں گے خواہ وہ اس تکلیف انتظار میں اس روز میں دفتر نہ جا سکوں اور بیگم صاحبہ کے کالج کا ناغہ ہو جائے اور ناشتہ تو بے وقت ہوا ہی، کھانے کے لیے بچے بھوک سے الگ بلبلا رہے ہیں، مگر جب تک مقدس ہستیاں نہ رخصت ہو لیں یہ نوبت کیسے آ سکتی ہے۔ غیر معمولی ناشتہ بنانے کی وجہ سے نوکروں کو کھانا پکانے کی وجہ سے اُن کے منہ الگ پھولے ہوئے ہیں۔ جس سے بات کرو پھاڑ کھانے کو دوڑ رہا ہے۔ آنتیں بھوک سے قل ہو اللہ پڑھ رہی ہیں مگر میزبانی کے فرائض اسی دم خم سے جاری ہیں۔ دل بار بار یہی کہتا ہے کہ یہ جائیں تو ہم پکائیں اور کھائیں۔

بیگم صاحبہ مہمان داری سے نہیں گھبراتیں نہ میری طرح مہمان دیکھ کر ان کا نروس بریک ڈاؤن ہوتا ہے، مگر آنے والے کی آئے دن کی فرمائشوں

نے ضرور ان کا حلیہ بیر نگ کر رکھا ہے۔ یعنی روزمرہ کے لیے تو چائے کے ساتھ بسکٹ اور توس ہضنے پڑ رہے ہیں۔ مگر مہمان کا اصرار ہے کہ "دلہن کے ہاتھ کے شاہی ٹکڑے پسند ہیں"۔ ۔ ۔ دوسرے بزرگ مچلے ہوئے ہیں کہ "واہ یہ کیسے ممکن ہے کہ لکھنؤ میں دستر خوان بچھے اور اس پر کلو کے یہاں کے نہاری کلچے نہ ہوں، قبر والی پوریاں نہ ہوں، گولہ گنج والے میر صاحب کے یہاں کی ربڑی نہ ہو، کریم کے یہاں کے سیخ کے کباب نہ ہوں، رام بھروسے کی مٹھائی نہ ہو اور کچھ نہ ہو تو کم از کم ٹنڈے کے کباب تو ضرور ہوں۔"

بھائی صاحب کے سسر صاحب قبلہ جو دراصل پنشن نکلوانے آئے ہیں الگ بضد ہیں کہ۔

"میں تو دلہن کے ہاتھ کے ورقی پراٹھے کھاؤں گا۔"

اگر مہمان صاحب خود ہمارے براہ راست مہمان نہیں ہیں بلکہ مع ایک عدد سفارش کے ہمارے سر پر مسلط ہیں یا ہمارے کسی مہمان سے برسوں کے بعد ملنے کے بہانے ڈٹے ہوئے ہیں، تو وہ باہر ہی سے کہلوا بھیجیں گے۔

آج کل پرہیزی کھا رہا ہوں۔ اس مہینے تو کھچڑی کے ساتھ دیسی گھی کافی ہوگا۔ البتہ حکیم صاحب نے کہا ہے کہ نورتن چٹنی اگر نہ استعمال کی گئی تو ہاضمہ بگڑ جائے گا۔

یعنی ایک تو ہم دیسی گھی اور نورتن چٹنی کے پابند ہو گئے دوسرے یہ کہ قیام و طعام کا سلسلہ اب مہینوں ختم نہ ہوگا۔ اور کچھ دن کے بعد ان کی

دوا علاج کے پیسے بھی ہم ہی کو دینا پڑیں گے۔ اس زیر باری کو آپ وضعداری کہہ لیں، مگر ہم کچھ نہ کہیں گے، کیوں کہ ڈرتے ہیں کوئی سن نہ لے۔

میں مہمانوں سے نہیں ڈرتا مگر ان کے جلال سے ضرور ڈرتا ہوں، ہمارے ایک ایسے ہی جلالی مہمان آتے ہی گھر والوں کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیتے ہیں، نوکروں پر پڑنے والی ڈانٹ پھٹکار بہت جلد جوتالات میں تبدیل ہو جاتی ہے جس کا عام طور پر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نوکر بھاگ نکلتے ہیں اور ان کے فرائض بھی گھر والے ہی انجام دیتے ہیں۔ اس قسم کی ایک بڑی بی نے تو کمال ہی کر دیا۔ دسترخوان پر بیٹھنے کے بجائے اُسے الٹ دیا اور چیک کر بولیں۔

"پھٹکار پڑے! سالن میں ہلدی کی بو آ رہی ہے!" گرما گرم توے کی اتری روٹیوں کو کرکری ثابت کرنے کے لیے انھوں نے ہوا میں اچھال دیں اس کے بعد جو انھوں نے بڑبڑانا شروع کیا تو غذائی اشیاء میں آمیزش کی ملامت کے ساتھ ساتھ میری نسبت کو بھی پُن ڈالا۔ ایک بار بیگم صاحبہ کی ایک عزیزہ جوان سے بھی زیادہ جھگڑالو تھیں۔ ان کا سامان ٹیکسی سے اُتارتے وقت ہمارے ملازم نے پوچھ لیا۔

"آپ کتنے دن رہیں گی؟" انھوں نے کہا۔

"دو مہینے!"

نوکر گھبرایا ہوا آکر بولا"

"بیگم صاحبہ آپ انھیں سنبھالیے میں دو ماہ کے لیے گھر جا رہا ہوں!"

اور چل دیا۔ اُسے لاکھ روکا مگر اس نے دو ماہ بعد ہی شکل دکھائی ادھر ان عزیزہ نے آتے ہی گھی کا ڈبہ اپنے سامنے کوڑے پر پھنکوا دیا اور صحت کے سلسلے میں ایک طویل لیکچر الگ جھاڑ دیا۔ ترکاریوں کے بارے میں وہ ہر بار یہی کہتیں۔

"آخر یہ پیسے کس دن کے لیے جوڑے جارہے ہیں۔ ہم کوئی بکری ہیں جو ترکاری کھائیں، نا بابا اپنے دکامن اپنے پاس رکھو، ہمیں آدمیوں والا کھانا دو...... دال بھی کوئی کھانے کی چیز ہے۔ جب ہوتا ہے ہمارے سامنے بھینس کی سانی لاکر رکھ دی جاتی ہے۔ اس سے تو اپنے گھر بھلے تھے!"

غرض صاحب ان کے ہوتے بیگم صاحبہ کی میزبان کی حیثیت کم اور ناڑی باورچن یا بدسلیقہ گھر والی کی زیادہ ہو جاتی ہے۔ مہمان کو اس میں بھی دلچسپی نہیں کہ آج مہینے کی کون سی تاریخ ہے۔ یا میزبان کی جیب کا جغرافیہ کیا ہے۔ انھیں اس میں کیا دلچسپی کہ سودا ادھار منگا کر مہمانداری سے زیادہ وضعداری نبھائی جارہی ہے۔

کبھی ہمارے کسی ناشدنی مہمان کو بھول کر بھی یہ خیال نہ آیا کہ دن اور مہینے میں کیا فرق ہوتا ہے۔ اور ہماری بیگم صاحبہ مزاروں پر کس سلسلے میں چادریں چڑھا رہی ہیں اگر مہمان بھی تو کمال کر دیتے ہیں۔ کہ آتے ہی نہ صرف ہاتھ پیر ڈال دیتے ہیں۔ بلکہ معصوم بچوں سے بیگار لینا شروع کر دیتے ہیں۔ بس پلنگ پر بیٹھے بیٹھے حکم چلاتے رہیں گے۔ پانی بھی کوئی دوسرا

لائے تو یہ پیئیں ۔ اگر نوکر کام میں لگے ہوں تو پھر پنکھا بھی گھر ہی کے لوگ انھیں جھلیں ۔ یہ لوگ ایک گلاس پانی کے لیے، بیس بیس بار لانیوالے کے ہاتھ دھلوائیں گے اور پچاس بار گلاس منجھوائیں گے ۔

بڑی مصیبت یہ ہے کہ جاتے وقت سب سے گلے مل مل کر روئیں گے اور کہا سنا معاف کروائیں گے ۔ رسماً اپنے یہاں بلائیں گے، بچوں کو مٹھائی کے پیسے اور نوکروں کو انعام دیں گے ۔ بار بار شکریہ ادا کریں گے، ادھر انھوں نے کھاٹ سے قدم نکالا اور ایک کی دس دس سن لیجیے ۔ اس قدر لگائی بجھائی کریں گے کہ عرصے تک خاندان میں ہل چل مچی رہے گی، کھانا ناشتہ، بات چیت، رہن سہن، گھر اور گھر والے، ہر ہر چیز کا جگہ جگہ مذاق اڑائیں گے ۔

مگر صاحب ان باتوں میں بھلا کیا رکھا ہے، پھر دہی ہم اور آئے دن کے بن بلائے مہمان حالت یہ ہے کہ نوکر بھاگ چکے ہیں، نئے نوکر ادھر کا رخ تک نہیں کرتے، میں چڑچڑا ہو چکا ہوں، پچھلے پانچ سال سے اس کا موقع نہ مل سکا کہ مکان کا کرایہ ادا کر دیا جاتا، وقت بے وقت کے لیے پس انداز کیا ہوا ختم ہو چکا ہے، نوبت اب قرض ادھار کی ہے ۔ میری تو اب سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ اپنا تبادلہ کسی گم نام جگہ کرا لوں یا پھر انہی مہمانوں کے یہاں خود بھی مہمان کی حیثیت سے نازل ہونا شروع کر دوں ۔ تاکہ بقیہ زندگی ٹھاٹ سے کٹ جائے ۔

موسمی ہائے ہائے

ہائے جاڑا، ہائے گرمی اور ہائے برسات کے علاوہ بھی کچھ آپ نے کچھ سُنا ہے۔ ہم نے تو صاحب اسی ہائے ہائے میں زندگی کاٹ دی۔

اب جو جاڑا ہے تو ہر دم ہائے جاڑا اور اُف رے سردی کے ساتھ ساتھ بس دن رات گرمی کا انتظار ہے۔ ہر شخص کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں، جسے دیکھو جیسٹر، اسٹر میں لپٹا، سکڑا، لحاف میں ڈبکا، آتش دان انگیٹھی، الاؤ یا چولہے کے اندر گھسا جا رہا ہے۔ اس خطرے کے اظہار کے ساتھ ساتھ کہ۔

"جاڑا اس بار بلا جان لیے نہ ٹلے گا۔"

"سردی کی لہر ہے، لوٹ لوٹ کر آجاتی ہے، جانے کا نام نہیں لیتی یہ پالا، ٹھٹھرن، کہرا اور اس کے اوپر سے پھاوٹ جو برس گئی تو اور بھی ستم

ہو گیا۔ قیامت یہ کہ اولے بھی گرے اور بادل جو ذرا کھلے تو دھوپ میں جان نہ آئی مگر ہوا جو چلی تو جان ہی نکل گئی سردی الگ چمک گئی۔

اب کس کس کو یہ کون سمجھاتا پھرے کہ "بابا سردی، سردی ہے، جاڑا اسی کا نام ہے یہ ہر سال آتا ہے اس کے آنے نہ آنے اور کم یا زیادہ ہونے میں حکومت کا کوئی ہاتھ نہیں۔ شاید آپ اسے مذاق سمجھیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ آج بھی ایک بڑے صاحب سے میری جھڑپ ہوتے ہوتے رہ گئی۔ کیونکہ سردی کا رونا روتے ہوئے انھوں نے کپکپا کر کہا۔

"بھلا یہ حکومت ہے؟"

اب اسے میری بدتمیزی کہہ لیجیئے کہ اپنی ہنسی نہ روک سکا اور بڑی مشکل سے انھیں اس پر راضی کر سکا کہ۔

"چلیئے حکومت سہی، مگر جب کہنا ہی ہے تو پھر اسے آسمانی حکومت کیوں نہ کہیئے؟"

مگر آسمانی حکومت تک جب بات پہونچی تو اُن کی سمجھ میں نہ آسکا کہ وہ میری بات کی تردید کریں یا تصدیق مگر خوف خدا سے خاموش ضرور ہو گئے۔

پیارے عوام کے حافظے کو کیا کہئے کہ ہر سال جاڑے کو ایسا بھول جاتے ہیں گویا اس سے پہلے بے چارہ کبھی آیا نہ ہو اور اتفاق سے راستہ بھٹک کر آگیا ہے۔ یا یہ بھی کسی مخالف کی کارروائی ہے۔

اکثر یہ بھی خیال آتا ہے کہ کیا سردی کی مذمت سے جاڑا کم ہو

جاتا ہے۔ حالاں کہ اپنا تجربہ تو کم از کم یہی بتاتا ہے کہ جتنا زیادہ جاڑا مناؤ گے اتنی زیادہ سردی کھاؤ گے۔۔۔۔۔ ورنہ ہم نے تو ایسے ایسے جوان دیکھے ہیں جاڑے میں برف سے بھی ٹھنڈے پانی سے نہ صرف نہاتے ہیں بلکہ نہانے کے ساتھ ساتھ فلمی گانے بھی گاتے جاتے ہیں اور کیا مجال کہ اُن کے منھ سے جاڑے کیا معمولی سردی کی ایک بھی کوئی علامت نظر آجائے۔

ہمارے ایک بہادر دوست جاڑوں میں پانی کا نام سُن کر لحاف میں گھس جاتے، نہانا تو بڑی بات منھ دھونے کے بجائے ڈرائی کلیننگ سے کام چلاتے ایک دفعہ اُن کے گھر والوں نے انھیں بالکل مجبور کر دیا کہ وہ نہائیں۔ ان کے غسل کے لیے پانی کھولایا گیا، غسل خانے میں انگیٹھی دہکا کر اسے گرم کیا گیا۔ اور وہ کسی نہ کسی طرح روتے پیٹتے، سب سے خطائیں معاف کراتے حمام میں داخل ہوئے۔ تھوڑی دیر کے بعد نکلے۔ صفائی کی وجہ سے اُن کا چہرہ چمک رہا تھا۔ جلدی سے سب نے اُن کو چائے گرما گرم پلائی۔ ابھی اس بہادری کے کارنامے سُنا ہی رہے تھے کہ ان کی بیگم نے ہنگامہ کر دیا۔ معلوم ہوا کہ میرا شیر نہایا نہیں بلکہ صرف منھ دھو کر ادر پانی لڑھکا کر زندہ سلامت لوٹ آیا تھا۔ اس کے بعد اُن کو ہم سب نے پکڑ کر واقعی نہلا دیا۔ جس کی وجہ سے عرصے تک اُن سے بول چال بند رہی اور ہمارے لطیفوں پر انھوں نے ہنسنا تو کجا، مسکرانا تک چھوڑ دیا۔

کسی نہ کسی طرح خدا خدا کر کے جاڑے ٹلے اب گرمی کا دن رات انتظار سب کو شروع ہو گیا۔ مگر موسم تو جاتے جاتے رنگ دکھا جاتا ہے۔ ایک بار جو آندھی پانی کے ساتھ سردی کی لہر لوٹ آئی تو جسے دیکھیے رو رہا سا نظر آ رہا ہے۔ خیر صاحب وہ تو جاتے جاتے موسم نے ایک پاور شو، دے دیا۔

اب گرمی جو آئی تو بسنت رُت سے چہروں پر جو رونق آ گئی تھی وہ غائب ہو گئی اور پھر سب ہونق ہو گئے۔ جسے دیکھئے دھوپ سے بچتا بچاتا، پسینہ خشک کرتا۔ کوئی بجلی کے جانے کو رو رہا ہے، کوئی پارک میں درختوں کو ساکت کھڑا دیکھ رہا ہے کہ بغیر خدا کے حکم کے ایک پتی بھی نہیں ہلتی، کوئی صاحب رات بھر سوئے تو دن بھر خس کی ٹٹی میں دبکے رہے۔ اب جو گرمی نے زور باندھا اور تیز و تند ہوا کے جھکڑوں کے ساتھ ساتھ قیامت کی لُو چلنا شروع ہو گئی۔ جسے دیکھئے ہائے گرمی ہائے گرمی اور العطش العطش کرتا نظر آ رہا ہے۔

خس کی ٹٹیوں، بجلی کے پنکھوں، ایرکنڈیشنڈ مکانوں، کولر اور تہہ خانے یا پہاڑ پر چڑھ کر گرمی کی ہائے ہائے کرنے والوں کو چھوڑیئے۔ انھوں نے ریڈیو پر کمنٹری نہیں سنی، چھوٹی یا بڑی حاضری کے دوران گپ نہیں لڑائی موسم پر بات کر لی۔

لیکن وہ لوگ جو کل تک جاڑا ہائے جاڑا کرنے کے ساتھ ساتھ دن رات گرمی کے موسم کا انتظار کر رہے تھے۔ اب سب سے زیادہ گرمی

بے شاکی نظر آتے۔ ان سے کوئی کام کہئے، کوئی بات کیجیے۔ مگر کیا مجال کہ وہ آپ کا کوئی نوٹس بھی لیں۔ کھٹ سے کہہ دیں گے۔

"ارے صاحب آپ کو اپنی پڑی ہے؟ دیکھ رہے ہیں کس قیامت کی گرمی پڑ رہی ہے"

ہم نے ایک صاحب سے کہا۔

"چلتے ہیں سینما؟"

بولے۔

"آخر کس دن کی دشمنی نکال رہے ہو؟ کیا جان لینا چاہتے ہو؟"

ہم نے حیرت سے اُن کا منھ دیکھتے ہوئے وجہ پوچھی تو آب دیدہ ہوکر بولے۔

"تماشہ دیکھنے گئے اور اگر راستے میں لُو لگ گئی تو ہمارا ابھی تماشہ ختم ہو جائے گا!"

اس کے بعد پھر ان کی مزید اوج قبض کرنے کی ہمت نہ پڑی اور اکیلے ہی سینما چل دیے۔

ایک صاحب ہم سے ملنے گرمی میں پسینے میں تر بتر آئے، ہم نے اُن کی خدمت میں ایک گلاس برف کا پانی پیش کیا۔

انھوں نے برف کے خواص پر اتنی دیر تک روشنی ڈالی کہ یہ بظاہر جتنا ٹھنڈا ہے اس کا ردعمل اتنا ہی گرم ہوتا ہے، یہاں تک کہ پانی میں برف غائب ہو گیا اور پانی کی ٹھنڈک بھی ختم ہو گئی۔ اس کے بعد

انھوں نے اسے ایک سانس میں ختم کرتے ہوئے کہا۔
دیکھئے آج برف پیا ہے اب خدا ہی خیر کرے؟
کسی کو گرمی میں لو لگ گئی اور وہ چٹ پٹ ختم ہو گیا۔ بس اب جیسے دیکھئے۔ گرمی کو قیامت بنائے چلا آرہا ہے۔
"صاحب سُنا۔؟"
گرمی کے غم کے ساتھ ساتھ جیسے دیکھئے مایوس نظر آتا ہے۔ "کیا اس بار بارش نہ ہوگی؟"
زیادہ تر لوگوں کی دلی خواہش یہی تھی کہ مئی کے مہینے میں برسات کی جھڑی لگ جائے۔ خیر صاحب خدا خدا کر کے دھوپ غائب ہوئی بادل گڑگڑائے بجلیاں چمکیں، اور اب جو پانی برسنا شروع ہوا، تو آٹھ آٹھ دن کھلنے کا نام نہیں لیتا۔
ہمارے ایک بزرگ جو پچھلے کئی ماہ سے صرف موسم بہار اور برسات پر بات کرتے اور اشعار سُناتے جن میں گھنگھور گھٹاؤں اور ساون اور بھادوں کے گلے ملنے کا تذکرہ ہوتا۔ اب روز ہمارے پاس خبریں لاتے
"سُنا آپ نے بارش نے کیا قیامت ڈھائی، سینکڑوں مکانات گر گئے۔"
"دریاؤں میں ہر جگہ سیلاب پہ سیلاب آرہا ہے"
"اُف یہ برسات کی سڑی گرمی۔ کس قیامت کی حبس ہے جیسے دم نکلی جائے اس گھٹ گھٹ کے مرنے سے تو موت اچھی۔

"برسات بھی کوئی موسم میں موسم ہے، جدھر دیکھو پانی، کیچڑ، ایک مصیبت ہے"

غرض وہ موسم پر اور ہم اُن پر لاحول بھیجتے رہے
مگر آپ جانئے کہ ہمارا اور ہمارے دوست کا تو روز کا ساتھ ہے نہ جانے وہ کتنی برساتیں جھیل چکے ہیں۔ کتنی گرمیاں کاٹ چکے ہیں۔ اور کتنے جاڑے گزار چکے ہیں۔ مگر دوسروں کی طرح اُن کو بھی ہمیشہ ہر موسم کا انتظار رہتا ہے۔ اور پچھلے موسم کی تو ایسی باتیں کرتے ہیں کہ سننے والے کے منہ سے رال ٹپک پڑے۔
اس آئے دن کی موسمی ہائے ہائے میں اُن سے زیادہ تو ہمارا بُرا حال ہے کہ یہاں تو مارے سردی کے مرے جاتے ہیں اور وہ ہیں کہ رہ رہ کے جاڑے کی یاد دلاتے جا رہے ہیں۔
یہاں تو قمیص، سوئٹر، کوٹ، السٹر، جیسٹر پہنے لحاف میں گھیا رہے ہیں اور وہ ہیں کہ سردی کی لہر کے ساتھ پانی اور اولے کی پیشین گوئی کر کے بالکل ہمیں ٹھنڈا کیے دے رہے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ اس بار جاڑا ہماری جان ہی لے کر ٹلے گا۔

بور کی قسمیں

امریکہ کی ایک بیس منزلہ عمارت کی لفٹ ایک دفعہ فیل ہوگئی۔ بیسویں منزل پر رہنے والے چند دوست اوپر جانے کے لیے سستا ستا کر زینے چڑھ رہے تھے۔

جب پانچ دوست دم لینے کے لیے بیٹھ کر ہانپتے تو چھٹا دوست پیٹ پکڑ پکڑ کر ہنستا، جب اس سے ہنسنے کی وجہ پوچھی جاتی تو وہ یہ کہہ کر کہ۔

"اوپر پہونچ کر بتاؤں گا!" پھر بے تحاشا ہنسنا شروع کر دیتا۔ بیسویں منزل پر پہونچ کر جب سب اپنے فلیٹ کے سامنے پہونچے تو ہنسنے والے دوست نے خوش خبری سنائی کہ۔

"حضرات آپ کو یہ جان کر بہت مایوسی ہوگی کہ آپ لوگ دروازے

کی کنپٹی سب سے نیچے والی منزل پر بھی بھول آگئے ہیں!"

اس کو کہتے ہیں بور کرنا، اور جس نے بور کیا، اُس کو ہم "بور" کہیں گے۔ اگر آپ پوچھیں کہ "بور کون کرتا ہے؟" تو ہم عرض کریں گے کہ "بور سب کو بور کرتا ہے" مگر اس کے ساتھ آپ یہ بھی سمجھ لیجئے۔ تھوڑے بہت بور تو سب ہی ہوتے ہیں۔ کوئی کسی کے لیے اور کوئی کسی کے لئے ہوتا۔ کون کس کے لیے کم یا زیادہ بور ثابت ہوا۔ یہ تو وہی بتا سکتا ہے جو بور کی کسی بور سے پالا پڑ چکا ہو، مگر یہ تو سب ہی بتا دیں گے کہ "ہمارا فلاں، فلاں بور سے پالا پڑ چکا ہے" اور جس نے اُن کو نصیحت کی وہ دو دھ یاد دلا دیا ہوگا۔ وہ بھی تقریباً اسی سے ملتی جلتی بات بتائے گا۔ اس لیے کہا نہیں جاسکتا کہ وہ کون کس کو کب کتنا بور کر دے گا۔

بور کے ساتھ ٹریجڈی یہ ہوتی ہے کہ دنیا میں اس کی بوریت کے ڈنکے پٹ رہے ہوں مگر اس غریب کو ہوا بھی نہیں لگ پاتی کہ وہ کتنا گریٹ بور ہے لیکن اگر اسے معلوم ہو جائے تو ماننا تو دور کی بات ہوگی اسے کبھی شبہ بھی نہیں ہو سکتا کہ وہ کبھی کسی کو بور بھی کر سکتا ہے۔

فی زمانہ کون ایسا شخص ہو سکتا ہے جو بور نہ کرتا ہو، لیڈر اپنی تقریر سے، محبوب اپنے وعدے سے، ملازم اپنی مصروفیت سے، اُمیدوار اپنے انتخابی ہتھکنڈوں سے۔ ووٹر اپنی بے جا اکڑ فوں سے، وکیل اپنی چرب زبانی سے، دودھ والے پانی سے بے تعلقی کا اظہار کر کے، دکان والے اور ہوٹل والے تھاک تیھر کھلا کے۔ مالک مکان کرایہ دار کو مجبور کر کے

ذمہ دار فائیل پا کے، شاعر گا کے، پڑوسی مانگ کے، لاؤڈ اسپیکر والے چلا کے، اور نقاد اپنی لاعلمی پر علم کا پردہ ڈال کے، غرض ایشیا کے عظیم ترین دانشور سے لیکر گلی کے گھس مہتر تک سب کو سب بور کرتے ہیں

اب آپ ہی بتائیے کہ بھلا اس کو کیا کہیئے گا کہ آپ کی پھلجڑیاں چھوڑنے میں مزا آرہا ہو اور مخاطب سنی ان سنی کر کے موسم اور مہنگائی کی کھیر دیں چھیڑ کر بور کر دے۔ یا آپ تو جلدی میں ہوں، گاڑی پکڑنا یا صاحب سے پہلے دفتر میں پہنچنا ہو؟ راشن کی لائن یا پکچر ہاؤس میں ایڈوانس بکنگ کرانا کسی مرحوم کو قبرستان پہونچانا ہے۔ مگر موصوف بلا کسی پروگرام اور ضرورت کے آپ کو اس وقت تک گھیرے رہیں گے جب تک آپ کے سارے بنے بنائے کام بگڑ نہ جائیں۔ آپ لطیفوں سے مرثیوں پر نہ اتر آئیں۔ گاڑی یا ملازمت نہ چھوٹ جائے۔ بغیر کھائے یا سینما دیکھے جینے کی نوبت آجائے یا برادری حقہ پانی بند کر کے ٹاٹ باہر کر دے۔

لطف کی بات یہ ہوگی کہ جہاں آپ ان کے بے تکان جمے رہنے سے بور ہوں گے وہاں آپ کی بے جا تعجلت پر موصوف کو حاضی بوریت ہوگی۔ مگر آپ میں سے ایک بھی نہ کہے گا کہ "بور کر کے آرہا ہوں" بلکہ یہی ارشاد ہوگا کہ۔

"بور ہو کے آرہا ہوں!"

"آج ہمارا پالا بھی کس بور سے پڑ گیا۔!"

تعجب نہیں کہ آپ کی پر لطف باتوں کی بوریت سے وہ اونگنے لگے ہوں

اور اُن کے بے تحاشہ ہنسنے پر آپ کو سخت تعجب ہوا ہو کہ "آخر اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے ؟" یا وہ لطیفہ سننے کے بعد انکوائری کریں کہ :-

"بھیا ہمیں بھی بتا دو کہ اس میں کہاں اور کیوں ہنسا جائے ؟ ؟"

کیا عجب ہے کہ جو لطیفہ آج سُن کر محض اس لیے ہنسے کہ آپ ہنستے تھے۔ اس کو دو تین دن کے بعد سمجھ میں آنے پر آپ سے زیادہ ہنسیں۔ عقلمندوں کا کہنا ہے کہ۔

"ایک بور کسی لطیفے پر تین بار ہنستا ہے۔ پہلی بار اس وجہ سے ہنستا ہے کہ سب ہنس رہے ہیں، دوسری بار اپنی حماقت یاد کر کے ہنستا ہے اور تیسری بار لطیفہ سمجھ میں آنے پر ہنستا ہے"

ڈبل بور - ایک دم بور پروف ہوتا ہے۔ یہ اندر سے بھی اتنا ہی بور ہوتا ہے جتنا کہ باہر سے بور معلوم ہوتا ہے۔ اس قسم کے بور بہت عام ہیں۔ ان سے آپ بچ نہیں سکتے۔ یہ تعارف اور تعلقات کی شرط سے مستثنیٰ ہوتے ہیں اگر سینما میں یہ آپ سے ٹکرا جائیں تو آپ ان کی رننگ کمنٹری سے عاجز آ کر ادھوری فلم چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوں گے۔ اگر ریل یا بس میں مل جائیں تو آپ اپنے اخبار، رسالے، کتاب اور جگہ سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ اگر یہ درجے میں ہوں تو لکچر کان سے نکل جائے اور خیر سے اگر یہ آپ کے پڑوسی ہیں تو شاید آپ کو گھر سے بھی ہاتھ دھونا پڑے۔

غرض ڈبل بور سے پالا پڑنے کے بعد اس بات کا بہت کم امکان رہ جاتا ہے کہ خود آپ کسی کو بور کر سکیں۔

۔بور بور تو لیڈر اور شاعر کو بھگا کرنے کے لیے بطور ہوٹنگ استعمال
کیا جاتا ہے۔ بڑا کامیاب حربہ ہے۔ تجربہ بتاتا ہے کہ زندہ باد اور مردہ باد
کے نعروں سے کہیں زیادہ زوردار اور کامیاب رہتا ہے۔ اس ایک نعرے
میں بیک آواز سب نعرے سما جاتے ہیں۔

عام طور پر بور بور کے نعرے اس لیے لگائے جاتے ہیں کہ وہ ایک
کو بور کر کے جس کا بھلا نہیں ہوتا لہٰذا وہ ہزاروں کے مجمع کو بور کرنے کے
لیے اسٹیج پر آتا ہے مگر لوگ بجائے بور ہونے کے خود اس کو بور کر دیتے
ہیں۔ پیاری پبلک اس مجمع اکھاڑ کو پچھاڑنے کے لیے زبردست ہوٹنگ
کرتی ہے۔ پھر یہ پٹھ تڑا کے بھاگتا ہے۔ اگر یہ نہ بھاگے تو منتظمین اسے
بھگا دیتے ہیں کیونکہ جلسے میں فرنیچر، لاؤڈ اسپیکر، گیس، دری، شامیانے
اور سپیک وغیرہ عام طور پر کرایے کی ہوتی ہے۔ اگر منتظمین ایسا نہ
کریں تو ان کو سند کے طور پر توڑ پھوڑ کا بھگتان بھگتنا پڑے۔

اس کی بوریت کا انعام ہوٹنگ کی شکل میں ملتا ہے لیکن اگر اس
کی ہوٹنگ نہ کی جائے تو جلسے کا کیریر خطرے میں پڑ جاتا ہے جسے
بچانے کے لیے اسے فری کیریر بنا دیا جاتا ہے۔

یار بور بد ہر ذات کے ہونے کے باوجود بڑے ہی بد ذات ہوتے ہیں
یہ اپنے دوست، استاد، واقف کار اور رشتے دار کا مغز چاٹ چاٹ
کر بور کر دیتے ہیں۔ مگر دماغ چاٹنے کے بعد بھی پیچھا نہیں چھوڑتے۔
دراصل یہ آپ کی ہر چیز چاٹ سکتے ہیں۔ روپے، پیسے، کپڑے،

جوتے، چائے، ناشتہ، کھانا وقت اور عزت، غرض ان سے کچھ بھی محفوظ نہیں رہ سکتا۔ حتیٰ کہ خود آپ بھی نہیں۔ ان کا لیا ہوا اُدھار کبھی ادا نہیں ہوتا، مانگے کے کپڑے پھر واپس نہیں ہوتے۔ یہ جتنی دیر بات کریں گے آپ فیصلہ نہ کر سکیں گے کہ آخر یہ کہنا کیا چاہتے ہیں۔ اور ان کی اس بوریت کا مقصد کیا ہے؟۔

باُئیس بور: کوئی ایک بور ہرگز نہیں ہو سکتا، خواہ وہ کتنا بڑا بور کیوں نہ ہو بلکہ کئی بور مل کر اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے لیے یہ ٹیم بنا کر بور کرتے ہیں۔ اس قسم کے بور آپ کو کافی ہاؤس، اسکول، کالج اور یونیورسٹی میں ملیں گے۔ یہ ہر حماقت اور بوریت میں آپ کے برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ بغیر پیسے کوڑی کے شہر بھر کے ہوٹل کھلوا تے جاتے اور بند کراتے رہتے ہیں۔ یہ بغیر پڑھے لکھے اور کام کیے اسکولوں دفتروں اور کارخانوں میں وقت گزاری کے لیے جاتے اور کسی ہوٹل میں جام ہو جاتے ہیں۔ ان سے ملتے وقت بوریت اور مروت میں کشمکش ہوتی ہے۔ اور ان کے جانے کے بعد بڑی کوفت ہوتی ہے۔

نمبری بور وہ ہوتے ہیں جو گھر ہی سے کہلوا دیتے ہیں کہ:۔

"وہ کہہ رہے ہیں کہ ہم گھر پر نہیں ہیں!"

آپ کا کتنا ضروری کام کیوں نہ ہو مگر یہ ٹس سے مس نہ ہوں گے اور ایسے غیر متعلق بن جائیں گے کہ گویا کچھ جانتے ہی نہیں۔

یہ آپ کو ملتے ہی ادھر اُدھر کی بے سر پیر کی ہانک کے کھٹ سے

بور کر دیتے ہیں۔ دوران گفتگو سنو سنو بار کا سنایا ہوا لطیفہ یا قصہ پھر سنائیں گے۔ ہر پرانی بات ان کے نزدیک برانڈ نیو ہوتی ہے، اس پر ان کی خوشی دیکھنے والی ہوتی ہے۔

لیکن یہ نہ بھولیے کہ اگر کبھی کسی نمبری بور کا کوئی کام آپ سے پڑ گیا تو وہ اس وقت تک آپ کو گھیرے رہے گا جب تک کہ آپ "کام نہ آجائیں"۔

مہا بور: بوریت کی وہ قسم ہے جو میاں بیوی سے زیادہ کوئی نہیں سمجھ سکتا شوہر، بیوی کو مہا بور سمجھتا ہے، مگر دوسروں کی بیویوں پر جان چھڑکتا ہے۔ تقریباً یہی ردعمل بیویوں کا بھی ہوا کرتا ہے۔

مہا بور کو اپنے میاں، بیوی، بچوں، گھر، دفتر، ملک اور قوم میں دنیا کی خرابیاں اور برائیاں برابر نظر آتی رہتی ہیں۔ اسے ہر اس چیز سے جو اختیار کی ہو پیار ہوتا ہے اور اس میں اسے پھر ہر خوبی نظر آجاتی ہے، یہ زندگی بھر دوسروں کو بور کرتے اور خود گھاس کھودتے رہتے ہیں اور ان کی عقل اس گھاس کو چرتی رہتی ہے۔

کائیاں بور کا دنیا میں صرف ایک مقصد ہوتا ہے کہ بس کسی طرح سے جھٹ پٹ اپنا الو سیدھا کر لے۔ جس طرح بھی ہو گھر گھیر کے باتیں بنا کے، لڑ کے، اکڑ کے، خوشامد کر کے۔

یہ اپنے کو جتنا چالاک سمجھتے ہیں دوسرے ان کو اتنا ہی زیادہ بور سمجھتے ہیں۔

اگر آپ کو لیئے کے بارے میں تھوڑا بہت جانتے ہیں تو پھر ان کو سمجھنے

کے لیے آپ کو کچھ سمجھانے کی ضرورت نہیں۔

بلنڈر بور سب سے بدنام قسم کا بور ہوتا ہے اس کو دیکھ کر لوگ دور ہی سے کترانے کی کوشش کرتے ہیں کہ کہیں بلنڈر بور سے سابقہ نہ پڑ جائے اس خانے میں رقیب، شاعر، ساہوکار، اور انکم ٹیکس والے آتے ہیں۔

یہ راستہ روک کر جتنی دیر آپ سے صرف سلام دعا کریں گے اتنی دیر میں آپ کسی بھلے آدمی سے باقاعدہ گپ لڑا سکتے ہیں۔ ان کو دیکھ کر بڑے بڑوں کے رنگ فق ہو جاتے ہیں چہرے لٹک جاتے ہیں اور اختلاج شروع ہو جاتا ہے۔

دنیا کے ہر مسئلے پر بلنڈر بور کی ایک بے سوچی سمجھی رائے ہوتی ہے شاید اسی لیے کہا گیا ہے کہ آپ ملک الموت سے بچ سکتے ہیں، مگر بلنڈر بور سے نہیں۔

بور پروف کہیں لاکھوں میں ایک ہوتا ہے۔ اگر یہ پہلی گوٹی پر اتر آئے تو شہرت میں بڑے سے بڑے شاعر کو مات دے دے۔

بور پروف اس لحاظ سے بھی قابل ذکر ہے کہ اس کی آمد ہمیشہ عام دلچسپی کا سامان کر دیتی ہے۔ اور خوبی یہ کہ ایک بات اور ایک نظر میں لوگ تاڑ لیتے ہیں کہ یہ بور پروف ہے۔

یہ اس قدر معصوم ہوتا ہے کہ اس کو علم بھی نہیں ہو پاتا کہ یہ کس قدر بور ہے اگر معلوم ہو جائے پر بھی کسی قسم کا اثر یا ردعمل نہیں ہوتا۔ یہ دھن کا

پکا ہوتا ہے اور سیاسی لیڈروں کی طرح اڑیل ہوتا ہے۔ اس لیے آسانی سے میدان نہیں چھوڑتا مجبوراً میدان سے خود چھوڑ دیتا ہے۔

میدان چھوڑنے کی بات آئی تو یاد آیا کہ بور کے بارے میں اتنا کچھ بتا کر کہیں میں نے آپ کو تو بور نہیں کر دیا؟

چلتے چلاتے شاید آپ "بور کے لڈو" کے بارے میں پوچھیں تو میں کہوں گا کہ "بور کے لڈو" اور آموں کے بارے میں اس وقت کچھ کہنا بے موسم کی راگنی سے کم نہ ہوگا۔

اب رہی آپ کے بور ہونے نہ ہونے کی بات تو قبل اس کے کہ آپ اس آئینے میں میرا یا اپنا عکس تلاش کرنے کی کوشش کرنے کی کوشش کریں کیوں نہ میں خود میدان چھوڑ کر آپ کو بور کر دوں۔

ادب میں بینک بیلنس

لیجیے صاحب! اب تک سنا کرتے تھے کہ فلاں سیٹھ، ساہوکار یا ایکٹر کے گھر فرم یا بینک لاکرز پر چھاپہ مار کر اتنا کالا دھن برآمد کر لیا گیا۔ یا فلاں اسمگلر کے قبضے سے اتنی ناجائز کرنسی، سونا، گانجا یا چرس برآمد کر لی۔ مگر آج اخبار پر نظر پڑتے ہی مارے حیرت کے تقریباً اچھل پڑا۔ جلی حروف میں شاہ سرخیوں کے ساتھ لکھا ہوا تھا۔

• ملک کے طول و عرض میں، ادبی اسمگلروں، لٹریری ایکٹروں ساہتیہ کار سیٹھوں اور سرمایہ دار ادیبوں کے گھروں اور کارخانوں پر بڑے پیمانے پہ چھاپے؟

ایک سنسنی خیز خبر تھی کہ ''محکمہ سیلز ٹیکس کے ذمہ داروں نے اسپشل انفورسمنٹ اسٹیبلشمنٹ کے عملے کے ساتھ کسانوں، مزدوروں اور محنت کشوں کے ایک

ایک بوُژوا ادیب کے گھر سے جب کالا ادب برآمد کرنے کے لیے چھاپہ مارا تو غریبوں کا یہ نجات دہندہ شراب کے ایک ٹب میں قوم کا غم غلط کر رہا تھا۔

ملزم بھوند و بھائی اینڈ بھوند و بھائی پرائیوٹ لیمیٹڈ کے کھاتوں کی جانچ پڑتال سے پتہ چلا کہ سیلس ٹیکس والے جس کو گھر سمجھ رہے تھے در اصل وہ ایک عالی شان ایرکنڈیشنڈ محل تھا اور جس میں ادب کی ایک بہت بڑی فیکٹری چالو تھی جس میں مختلف ملکوں کے ادب کے ترجمے کا ہول سیل میں کام ہو رہا تھا۔

اقبال جرم کے دوران خاصی پٹائی کے بعد بھوندو بھائی نے بتایا کہ اب وہ رائٹر یا ٹائپ رائٹر نہیں بلکہ کمپیوٹر ہو چکے ہیں۔ لہذا، ان سے جتنا لکھوا لو، کیونکہ اس کے لیے اگر ۵۰ روپیہ صفحہ بھی ہم ترجمے کا کام کرتے ہیں۔ تو ہمارے پردستاری ادیب چار آنے آٹھ آنے صفحہ دوڑ کر ترجمہ کر دیتے ہیں!۔

بھوندو بھائی نے اپنی ادبی اور قومی خدمات پہ روشنی ڈالتے ہوئے یہ بھی انکشاف کیا کہ ،، ملک میں چھوٹی بچت کی جو قومی اسکیم چل رہی ہے اس کو کامیاب بنانے کے لیے ہم یہ چونی اور اٹھنی بھی زیادہ تر رکھ ہی لیتے ہیں۔

سیلس ٹیکس کے ایک ترجمان نے اخباری نمائندوں کو بتایا کہ ،، بھوندو کے لیفٹننٹ کی نشاندہی پر اس ادبی محل سے لاکھوں روپے کی مالیت کے ریفری جریٹر، غیر ملکی کرنسی، مشینیں، ٹائپ رائٹر، موٹر، قالین، جواہرات کالا دھن اور بڑی تعداد میں ایسی کتابیں بھی برآمد ہوئی ہیں جو ایک بوگس ادبی انجمن کے نام پر دوسرے ملکوں سے بطور امداد حاصل کی گئیں تھیں تاکہ

اس رقم سے ملک میں انقلاب لایا جا سکے ؟

بھوندو کے لفٹننٹ نے کافی پٹائی کے بعد یہ بھی اقرار کیا کہ "ان سب کتابوں کا تعلق عالمی ادب عالیہ سے ہے جس کو ہم لونڈے لاڑیوں سے آدھے پونے ترجمے کروا کے بڑے بڑے جہازی اور جید ناموں سے چھپوا کر ایکس چینج کماتے تھے، مگر اب تک اس لیے انقلاب نہ لا سکے کیونکہ ہم میں خود انقلاب آگیا۔

اسپیشل انفورسمنٹ اسٹیبلشمنٹ کے ایک ذمے دار نے بتایا کہ "ادب کے نام پر اسمگلنگ کرنے والے یہ بورژوا ادیب عملاً ادب سے اتنا ہی تعلق رکھتے ہیں جتنا پٹواری کا اس کے کھاتے اور بنیئے کا اس کی کتاب سے تعلق ہوا کرتا ہے۔ ان کا نام نہاد ادب محض کاغذی خانہ پری ہے کہ کس ادب سے کیا لینا ہو، یا کس ادیب کے بہانے کیا حاصل کرنا ہے ؟

سیلس ٹیکس والوں نے بتایا کہ "ان کے خلاف" انکم ٹیکس ایکسائز اور کسٹم کی خلاف ورزیوں کے تحت اُن پر ساتھ ساتھ مقدمے چلیں گے اور سخت ترین کارروائی کی جائے گی "

خفیہ پولس نے ایک ادبی فیکٹری پر چھاپہ مارا جہاں ایک ادبی کانفرنس کے دعوت نامے تیار کیے جا رہے تھے۔ پکڑے جانے والے کاغذات سے انکشاف ہوا کہ "ایک عالمی کانفرنس کے بہانے لاکھوں روپیہ ادب کے نام پر حاصل کیا گیا تھا۔ اور اب وہ پبلک میں فروخت کے لیے ٹکٹ کے بجائے پاس تیار کر رہے تھے تاکہ تفریحی ٹیکس کی رقم مار کر خود تفریح کی جا سکے۔ کانفرنس کے لیے انھوں نے جو عطیات حاصل کیے تھے وہ ان کی جیبوں میں پہونچ

چکے تھے۔

یہ بھی کہا گیا کہ۔ اس کانفرنس میں انھوں نے ادیبوں کے بجائے اپنے رشتے دار دوست اور ہم مشرب بلائے تھے۔ اب اُن کے خلاف انٹی کرپشن والے کارروائی کریں گے۔

انٹی کرپشن نے ایک ادبی دکان پر چھاپہ مار کر ایک ادیب کی کئی سو تصنیفات پر قبضہ کر لیا جس کے بارے میں الزام لگایا گیا کہ "اس نے اپنے عہدے سے ناجائز فائدہ اٹھا کر یہ کتابیں اپنے ماتحتوں سے لکھوائیں تھیں مگر یہ سب کتابیں اس کے نام سے چھپی ہیں اور وہ ان کا باقاعدہ مصنف کہلاتا ہے۔ ان میں وہ کتابیں بھی شامل ہیں جو اُس نے پیسے دے کر خریدی تھیں۔ ایسے کچھ مسودات پر بھی قبضہ کر لیا گیا ہے جو اس نے لکھے ہوئے نہیں تھے مگر یہ انھیں اپنے نام سے چھپوانے کا پروگرام بنا چکا تھا"۔

انکم ٹیکس والوں نے ایک شاعر کے گھر پر چھاپہ مارا اور اس شاعر کے بہت سے ملازم پکڑے جو اس کے لیے چیزیں کہتے تھے اس کی تجوری سے تقریباً ۵۰ دیوان لاتعداد فلمی گیت برآمد ہوئے جو بے روزگار شعرا اور اس کے ملازم شعرا کے نتیجۂ فکر ہیں۔ ایسی تمام بیاضیں اور قلمی دیوان ان شعرا کو واپس کیے جائیں گے جنھوں نے انھیں تخلیق کیا تھا اور جو غزلیں، نظمیں اور فلمی گیت اس کے نام سے چھپے اور نشر ہو چکے ہیں۔ وہ اب اصلی ناموں سے شائع اور براڈکاسٹ کیے جائیں گے۔

پولیس والوں نے بہت سے ایسے خان بہادر، راے بہادر رائے بہادر قسم کے

پہلوان ادب بھی پکڑے گئے جو نہایت ذلیل قسم کے ادیب اور شاعر ہونے کے باوجود خود نہیں لکھتے بلکہ خریدے ہوئے کلام کے ساتھ ایک خوش کلام بھی رکھتے ان کا گلا خراب ہونے کی وجہ سے وہی ان کا کلام سناتا۔ ایسے ادیبوں اور شاعروں نے تھانے میں یہ اقبال جرم بھی کر لیا کہ "وہ صرف داد پانے کے گنہگار ہیں"۔ مگر پولس کو پریشانی یہ ہے کہ اس قسم کے زیادہ تر پکڑے جانے والے ہیں جو اپنے اثر و رسوخ کی وجہ سے اپنی جان ملنگے اپنا تنگے کی کتابوں پر انعامات تک حاصل کر چکے ہیں۔ ان کے انعامات اور تخلص جیل میں جمع کر لیے گئے ہیں۔

حکومت نے ایک بڑے ادیب کا لائسنس ضبط کر کے اس کو جیل بھیج دیا اس نے عدالت کے سامنے اقرار کیا کہ وہ اپنے آپ کو ملک بھر کے ادیبوں کا منتخب نمائندہ بنا کر اور اس کی فرضی خانہ پری کر کے ہر سال دوسرے ملکوں کا دورہ کرتا اور دوروں کے بہانے عیاشی کے ساتھ ساتھ ادب اور کالا دھن اسمگل کرنے کا بھی دھندا کرتا رہا ہے۔

ملزم نے اعتراف کیا کہ وہ اپنے بیوی بچوں اور دور کے رشتے داروں کو بھی ادیب ظاہر کر کے اپنے ساتھ دورے پر جا چکا ہے۔ مگر اس نے ان کو اپنا رشتے دار ظاہر نہیں ہونے دیا۔ ملزم اور اس کے کئی ایسے عزیزوں کی تصنیفات سرکاری خزانے میں جمع کر لی گئی ہیں جو مادری زبان میں کوئی حیثیت نہ حاصل کر سکنے کے باوجود دوسری زبانوں میں کلاسیکل ادب بنا کر چھپوا دی گئی تھیں۔ اور بہت سا ناجائز غیر ملکی مبادلہ زر دان پر

حاصل کر لیا گیا تھا۔

اس بڑے ادیب پر فریب دہی اور جعل سازی کے الزام میں مقدمہ چلے گا اور اس کو پھر سے باقاعدہ چھوٹا ادیب بنایا جائے گا۔ اور اس کا "جی آئی پی" (گریٹ انڈین پوئٹ) کا خود ساختہ لقب واپس لے کر تنبیہہ کر دی گئی ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں کے لیے آئندہ سے "عظیم" اور "عظیم ترین" کا لفظ استعمال نہ کرے۔

خوشامد میں آمد

جب قابلیت اور شرافت بھی کام نہ آئی اور اداکرکے بھی دیکھ لیا کہ اس میں بھی سوائے مٹی پلید ہونے کے کچھ ہاتھ نہ آیا تو خوشامد پہ اتر آئے۔ اس کے بعد تو ہم بھی مان گئے کہ سچ تو یہ ہے کہ

خوشامد سے خدا بھی راضی ہے

کامیابی نے خود بڑھ کے ہمارے قدم چومے اور چاروں طرف ہم ہی ہم نظر آنے لگے۔

یہ سمجھ میں آنے کے بعد کہ خوشامد بھی ایک آرٹ ہے، ہم نے طے کر لیا کہ اب ہم کو اس کا آرٹسٹ بلکہ خاص حالات میں کارٹونسٹ بننا ہے۔ آپ جانئے مچھلی کے بچے کو تیرنا کس نے سکھایا۔ لہٰذا دو چار ہاتھ پیر مارنے کے بعد ہم خوشامد کے بہترین مشناور اور

خوشامد خور ہو گئے

کوئی کام بغیر محنت اور مستقل مزاجی کے نہیں ہوتا۔ لہذا اس کا بھی اصول سمجھ میں آ گیا ہے کہ محض اوپری دل سے خوشامد کرنے یا ایک آدھ بار تلو چپو کرنے سے اسی طرح کام نہیں چلتا جس طرح سیدھی انگلی سے گھی نہیں نکلتا۔ لہذا، میاں دنیا میں رہنا ہے تو سب سے جھک کر ملو، اس دنیا کو کنواں اور اپنے کو پیاسا سمجھو، خود بہ نفس نفیس ہر کنوئیں تک پیاس بجھانے کے لیے جاؤ، جن لوگوں سے کام پڑ جائے ان کے پیچھے زمین کا گز بن جاؤ، بلکہ مستقل لگے رہو۔

ایک بات یہ بھی سمجھ میں آئی کہ اگر خوشامد ہنرمندی سے نہ کی جائے تو ذلیل ہونے کی نوبت آ جاتی ہے اور لوگ خوشامدی ٹٹو سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ لیکن ایسے لوگوں کے پیچھے بھی اگر برابر لگے رہو تو جلد ہی وہ آپ کی تمام خوبیاں مان لیتے ہیں۔ اور آپ میں ان کو دنیا کی اچھائیاں نظر آنے لگتی ہیں۔

چنانچہ خوشامد میں آمد کے لیے ہم نے بھی بڑی چلہ کشی کی، گرگٹ کی طرح رنگ اور پھکیت کی طرح پینترے بدلے۔ ہمیشہ خیال رکھا، کہ وار خالی نہ جانے پائے اور مفت میں بیٹھے بٹھائے کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔ جس کے لیے اصول بنایا کہ

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر بندے سے خود آگہ
یہی پوچھا کرے ہر دم بتا تیری خوشی کیا ہے

یہ بھی سمجھ میں آگیا کہ اگر دنیا میں کچھ کرنا ہے تو خودداری وغیرہ کے چکر میں پڑکر بنا بنایا کیریر تباہ کرنے کی ہرگز ضرورت نہیں۔

خوشامد میں کامیابی اسی وقت ممکن ہے جب کہ بدتمیز سے بدتمیز، بدزبان سے بدزبان اور بددماغ سے بددماغ آدمی آخر میں آپ سے رام ہوکر آپ کا کلمہ پڑھنے لگے۔

اب اس سلسلے میں ہماری خوشامد میں کامیابی کا ایک واقعہ سننے کے بعد خود ہی انصاف سے کہیئے کہ ہم اس میں کس حد تک کامیاب ہوئے۔

قصہ یوں ہے کہ ایک اڈیٹر صاحب نئے نئے ہمارے اخبار پر نازل ہوئے، آدمی ایسے فرعون قسم کے صاحب بہادر کہ انھیں کوئی کام، کوئی بات پسند ہی نہ آئے، بات بات پر کاٹ کھانے کو دوڑے، ہر کام میں ہزار خامیاں نکالیں۔

ایک دن ہم سے بھی موصوف کا پالا پڑ گیا۔ چھوٹتے ہی بولے۔

"یہ حرام خوری ہو رہی ہے، ہمیشہ دیر سے آتے ہو، دفتر کو کلب بنا رکھا ہے، کام کے نام سے جان نکلتی ہے۔ نالائقی کی حد کر دی، ایک جملہ تک صحیح نہیں لکھ سکتے، خبریں بناتے ہو کہ گھاس چھیلتے ہو؟"

جب موصوف گرج برس چکے تو ہم نے چہرہ بھیگی بلی کی طرح مسکین بنا کر عیارانہ مسکراہٹ کے ساتھ انتہائی مؤدب ہو کر عرض کیا۔

"صاحب اخبار کی قابلیت تو آپ پر ختم ہے۔ انھوں نے تقریباً آپے سے باہر ہوتے ہوئے گرج کر خشم ناک نگاہوں سے گھورتے ہوئے گھر کے

کر کہا۔

"جی ہاں"

"جی ہاں! بڑے بڑے اڈیٹر دیکھے مگر یہ قابلیت کسی میں نہ پائی"

تقریباً وہ ھنکارتے ہوئے کہا۔

"بس رہنے دو منہ دیکھی تعریف کو"

ہم نے سنی اَن سُنی کر کے اُن پر سے قربان ہوتے ہوئے عرض کیا۔

"بس ایک بات دریافت کرنے کی اجازت چاہتا ہوں؟"

اڈیٹر صاحب نے قہرناک نگاہوں سے گھورتے ہوئے کہا۔

"وہاٹ؟"

"حضور آپ کو ترجمے کی باریکیوں پر حیرت انگیز عبور کیسے حاصل ہوا واللہ لفظ نہیں لکھتے آپ نگینے جڑ دیتے ہیں۔ یہ فن آپ نے کہاں سے سیکھا؟" اس میں تو صاحب آپ کا جواب نہیں!"

اڈیٹر صاحب تقریباً شیشے میں اترتے ہوئے اٹھلا کر بولے۔

ایک ایک لفظ لکھنے کے لیے پوری پوری عبارت نہ جانے کتنی بار کاٹتا اور لکھتا تھا، الفاظ اور معنی کے سلسلے میں نہ جانے کتنی ڈکشنریاں رٹیں تب کہیں یہ آرٹ آیا۔ بڑا ہم نے ریاض کیا ہے۔ قلم برداشتہ لکھنا مذاق ہیں ہے"

ہم نے عمر عزیز مفت گنوانے پر ماتم کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"بتلائیے اب ہم اپنی جہالت کیسے دور کریں، اگر شروع سے آپ کے نقش قدم پر چلتے ہوتے تو آج آپ کی خدمت کے لائق ہوتے" بولے

آپ کو ترجمے کا فن سیکھنا چاہیئے۔"
حضور پھر آپ ہی فرمائیں کہ اس سلسلے میں اب کیا رُخ اختیار کیا جائے؟"

انھوں نے فوراً پیشہ ورانہ گُر اور بزنس آرٹ بتاتے کے ساتھ بہت سی فنِ صحافت پر کتابیں اور ترجمے کے سلسلے میں کچھ رسالے بتا دیئے۔

اب خوشامد کا یہ ٹھوس تعمیری پہلو بھی ملاحظہ فرمایئے کہ ہم نے وہ کتابیں اور رسالے گھول کر پی لیے۔

اس کے بعد اڈیٹر صاحب غیر ملکی دورے پر جا رہے تھے۔ ہم نے بجائے ۵ پیسے کے گیارہ روپے کا امام ضامن باندھ دیا۔ اور بیگم صاحبہ کی خیریت کے بہانے اُن کے گھر تحفے تحائف بھیجنا شروع کر دیے۔

موصوف جب دورے سے واپس آئے تو ہمارا دور شروع ہو گیا۔ وہ اتنے مہربان ہو گئے، کہ پہلے تو ہم سے دفتر کے اہم معاملات میں مشورہ لینا شروع کیا۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ ایسے شیشے میں اُتر آئے کہ بغیر ہماری اجازت کے نہ قلم اٹھاتے نہ کوئی حکم جاری کرتے۔ غرض دیکھتے ہی دیکھتے ہم اُن کی ناک کا بال ہو گئے۔

جب اڈیٹر صاحب پورے طور پر ہمارے قابو میں آ گئے تو ہم نے اُن سے بھی اوپر پرواز کی، اور جج صاحب کے ہاتھوں میں صاحب بہادر کی سزا اور جزا بھی ان کو مٹھی میں لینا شروع کر دیا۔

بڑا صاحب پاگل آدمی، سوائے اکڑ فوں کے کچھ آتا نہ تھا۔ ایک دن

ہمیں دیکھتے ہی بولا۔

"بتاؤ اس وقت دن ہے یا رات؟"

عرض کیا۔

"جو حضور فرمائیں۔"

"بولے۔

"نہیں تم بتاؤ۔"

"میری کیا مجال جو آپ کے سامنے زبان کھولوں۔"

اس گفتگو کا نتیجہ یہ ہوا کہ بڑے صاحب کی رائے روز بروز ہمارے بارے میں بہتر اور ہمارے صاحب کے بارے میں بد سے بدتر ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ ایک دن دفتری بے قاعدگیوں اور بدعنوانیوں کی اُن رپورٹوں کی بنیاد پر جو ہم نے صاحب کے خلاف مع ثبوت بڑے صاحب کو فراہم کی تھیں۔ اُن کی تنزلی اور ہماری ترقی ہو گئی۔

اب اپنے صاحب کے ہم صاحب ہیں اور وہ ہمارے ماتحت، لہٰذا ہم نہایت بے تکلفی سے انھیں گھرکا کرتے ہیں اور وہ نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ نہ صرف ہماری ڈانٹ ڈپٹ سنتے ہیں بلکہ ہمارے مکھن بھی لگاتے ہیں تاکہ ان کی بگڑی بنی رہے۔

وہ دن بھی اب دور نہیں جب بڑے صاحب کے ہم صاحب ہوں گے اور وہ ہمارے ماتحت ہوں گے۔ اسی طرح ہم خوشامد کی بدولت ترقی کے زینے طے کرتے رہیں گے۔

کبھی صاحب لوگ منہ کھولے، آنکھیں پھاڑے ہمیں رینہ خطمی ہوئے
دیکھا کرتے تھے اور آج ہم ان کا، کارٹون دیکھا کرتے ہیں۔

اس عظیم الشان کامیابی کے بعد اب ہمارا ارادہ اس فن پر ایک مستقل
کتاب لکھنے کا ہے، جو ہماری زندگی بھر کی مکھن بازی کے عملی تجربات کا
نچوڑ ہوگی۔ اس میں ہم دلائل و براہین سے ثابت کریں گے کہ " دنیا کا یہی
دستور ہے کہ بغیر چکنی چپڑی باتیں بنائے کام نہیں چلتا، ہر ذی روح
کچھ نہ کچھ ٹیڑھا ضرور ہوتا ہے۔ ہر شخص میں کچھ نہ کچھ سنک لازمی ہوتی
ہے۔ مگر ایسے تمام آڑے ترچھے لوگ خوشامد سے بالکل سیدھے ہو جاتے
ہیں۔ لہٰذا اگر دنیا میں کسی کو کچھ کرنا ہے تو اسے اوّل نمبر کا حرام خور،
کام چور، نوالہ حاضر، خوشامدی، لیچڑ، مصاحب، لیموں نچوڑ، جی
حضوریا، مکھن لگانے اور روغن قاز ملنے کا بہترین ماہر ہونا چاہیے
اور اسے اس وقت تک خوشامد میں انتہائی ثابت قدمی سے لگا رہنا
چاہیے جب تک کہ موصوف پگھل کر پانی نہ ہو جائیں۔

ہمارے ذاتی تجربات اور مشاہدات کے مطابق خوشامد کا سب پر
اثر ہوتا ہے اور بالکل ایٹم بم کی طرح ہوتا ہے۔ یہی اس کا کمال اور کلید
کامیابی ہے۔

خوشامد کے لیے ضروری ہے کہ آپ علم مجلس، داستان سرائی، تاریخ
دانی، بذلہ سنجی، مزاج شناسی، حاضر جوابی، مٹھیک بازی اور پروپیگنڈے
کی بنیادی قدروں، ترقی پسند رجحانات، سائنسی نظریات اور گر سے

بخوبی واقف ہوں ۔ تاکہ اچھے بھلے آدمی کا دماغ ساتویں آسمان پر پہونچا کر اپنا الّو سیدھا کر لیں ۔

خوشامد ایسا جادو ہے جو سر پر چڑھ کر بولتا ہے ، اس سے خدا اور بندہ دونوں خوش رہتے ہیں ۔

ہماری اس لاثانی تصنیف کی بنیاد ۔۔ "تہار اج چوپٹ راج ، ان کے ملازم اور بینگن کی ترکاری" کی سبق آموز حکایت پر ہوگی ، جس کا ہر پڑھنے والا اس پر عمل کر کے بیک وقت انتہائی آسانی سے حاکم محبوب ، دربان ، رقیب ، رئیس اور بیوی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے قابو میں لے آئے گا ، اس کتاب میں خوشامد کے وہ بیتر بہدف نسخے اور گُر ہوں گے ۔ جن پر عمل کرنے کے بعد دولت اور کامیابی آپ کے قدم چومے گی اور آپ صدق دل سے اس بات کے قائل ہو جائیں گے کہ "خوشامدیں آمد"

ماموں کا رشتہ

ماموں اور بھانجے کا کتنا گہرا تعلق ہوتا ہے اس کو ثابت کرنے کے لئے زندہ دلانِ لکھنؤ نے "ماموں بھانجے" کے نام پر ایک پورا محلہ آباد کر رکھا ہے۔ رشتوں اور رشتے داروں میں جتنا گہرا، دلچسپ اور دلخوش کن رشتہ ماموں کا ہوتا ہے شاید کسی اور قرابت میں ممکن نہیں۔ نہ اس میں سالے بہنوئی والا چھوٹ کا مذاق ممکن نہ دیور بھوجائی والی نوک جھونک کا امکان نہ اس بوریت کا دور دور پتہ جو نانا، دادا، چچا اور پھوپا ٹائپ کے رشتہ داروں سے پالا پڑنے کے بعد واقع ہو جاتی ہے کہ ادھر دادا جان کی نظر پڑی یا نانا جان نے گھڑکی دی اور آپ احتراماً دونا ہو کر بالکل گپ چپ لٹو ہو گئے۔

دور کیوں جائیے آج ہی کی بات سنئے میں جو یہ سب عرض کرنے کے

لیے گھر سے آپ کی طرف نکلا تو جناب راستے میں ایک اچھے خاصے بھلے آدمی سامنے سے چلے آ رہے تھے کہ کسی منچلے نے پان کی دکان سے جو آواز لگائی۔

"ماموں پان تو کھاتے جاؤ!"

اور وہ صاحب جو خدا جانے اُن صاحب زادے کے ماموں تھے بھی یا نہیں سڑک پر پڑا ہوا ایک پتھر اٹھا کر "رک تو سسر ے" کہہ کر بے اختیار لپکے بھانجے صاحب ریس کے گھوڑے کی طرح سرپٹ نکل گئے مگر یار لوگوں کے ہاتھ ایک مشغلہ آ گیا کوئی ماموں کو ادھر بلا تا ہے اور کوئی اُدھر اور ماموں ہیں کہ بھر کر آپے بلکہ جامے سے باہر ہوئے چلے جا رہے ہیں۔

اسی واقعے پر ایک ریل کا سفر یاد آ گیا جس میں ایک اسکولی لڑکے نے ٹی ٹی صاحب کو "ماموں" کہہ کر ایسا چراغ پا کیا کہ وہ حضرت چلتی ٹرین سے کود کر اس کے پیچھے لپکے۔

محلے کی چوکی کے منشی جی، جو خاصے سنجیدہ اور ذمہ دار واقع ہوئے ہیں ایک دفعہ کسی نے سلام کیا، انھوں نے دعا دی ان صاحب زادے نے سائیکل آہستہ کر کے پوچھا۔

"ماموں خیریت سے ہو؟"

اس کے بعد منشی جی اور سائیکل میں جو ریس ہوئی ہے ہم تو سمجھے کہ منشی جی کے کرنٹ لگ گیا۔ بیٹھے بیٹھے ایسا اچک کر دیکھی ہوئے کہ سائیکل کو اس بڑھاپے میں مات دے دی۔

اب آپ کو بھی اشتیاق ہو گا کہ یہ جو ماموں اور بھانجے کی اتنی ہوا باندھ

رہے ہیں تو بھلا ہم بھی تو سنیں کہ آخر ان کے ماموں کیسے ہوں گے۔ مگر آپ کو سن کر افسوس ہوگا کہ ہمارے کوئی ماموں نہیں اور جو دو ایک ماموں ہیں بھی تو برساتیں جھیلتے جھیلتے دادا جان اور نانا جان قسم کے کٹ کھنے اور خوں خوار بزرگ ہو چکے ہیں جن کو ہمیں خوش رکھنے کے لئے سرِ شام چوروں کی طرح اپنے ہی گھر میں داخل ہونا پڑتا ہے۔ فلمی گانے گانا تو بڑی بات ہے، ہم کو میر اور غالب تک کے ایسے اشعار جس کا عشق و عاشقی سے دور کا تعلق نہ ہو تحت اللفظ بلکہ دل میں پڑھنے پڑتے ہیں اور ڈانٹ ڈپٹ کے خوف سے باتیں کرنے کے بجائے کانا پھوسی کرنی پڑتی ہے۔

ہمارے ایک ایسے ہی سوکھے ساکھے نہ جانے کتنی برساتیں کھائے ایک بالکل ہی دھان پان ماموں تھے جن کو ہم لوگ "کارتوس ماموں" کہتے تھے، کیونکہ جب اُن کو غصہ آتا تو وہ بجائے غصہ کرنے کے سٹ سے کارتوس کی طرح چھٹ جاتے یعنی ایک ہی سانس میں ہماری سات پشتوں کو دھن کے رکھ دیتے۔ در اصل ایک سانس میں غصہ کر کے دوسری سانس میں اس لئے غصہ نہ کر پاتے کہ ان کو دمے کا عارضہ تھا اور ذرا بھی غصہ کرنے کے بعد ان کا دم پھولنے لگتا۔ ہم لوگ انھیں دیکھ کر ادھر اُدھر چھپنے لگتے۔ اور وہ "رک تو سہی" کہہ کے ایسا رپٹاٹے کہ ہم لوگ بھاگ بھی نہ پاتے بس اس کے بعد شُروع ہو جاتے۔

"یہ بینا کیوں جا رہا تھا؟"
"یہ کس کی آواز تھی؟"

"یہ پڑھنے کے وقت حساب کی کاپی پر کاٹا گولا کون بنا رہا تھا؟ بھلا یہ اُس کی کاپی ہے؟ اب کوئی منھ سے نہیں بولے گا۔ بولو یہ کس کی کاپی ہے ورنہ ابھی سب کو مرغا بنا دوں گا۔"

کسی کو پڑھتا دیکھتے تو اس پر برس پڑتے!

"ارے یہ کس قسم کی پڑھائی ہو رہی ہے، غضب خدا کا یہ کم بخت الجبرا پڑھ رہا ہے۔ الجبرا لگایا جاتا ہے یا پڑھا جاتا ہے؟"

اور پھر پڑھنے کی جگہ لکھنے اور لکھنے کے بجائے پڑھنے والوں کی شامت آجاتی وہ ڈانٹ پڑتی کہ چھٹی کا دودھ یاد آجاتا۔

خیر بھئی لڑکے کھیلتے ہوں، پڑھتے نہ ہوں یا شور کرتے ہوں اور اُن کو ڈانٹ پھٹکار کر سمجھا بجھا دیا جائے تو ٹھیک ہے لیکن صاحب اگر کہیں کار توس ماموں گھر میں گھسے اور انھوں نے دیکھا کہ سب بچے بہت شرافت اور انتہائی خاموشی کے ساتھ اپنے اپنے کمروں میں اپنی اپنی میز پر بیٹھے پڑھ رہے ہیں تو فوراً اُن کا ماتھا ٹھنک جاتا کہ آخر معاملہ کیا ہے؟ یہ سب اتنے مسکین کیوں بنے ہوئے ہیں۔ ضرور ان پاجیوں نے کوئی فتنہ ڈھایا ہے۔

پھر وہ والدہ، والد، چچا خالہ اور پھوپا سب سے پوچھتے اور جب ہر طرف سے انھیں مایوس کن جواب ملتا کہ "نہیں! آج لڑکوں نے کوئی شرارت نہیں کی۔" تو پھر وہ یہ سوچتے ہوئے کہ "بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ جہاں اتنے شیطان جمع ہوں وہاں کوئی شرارت نہ ہو۔"

مشکوک نظروں سے پھر سب بچوں کو دیکھتے اور کچھ بس نہ چلتا تو

ایک بار بگڑ کر پوری آواز سے چلا کر کہتے ۔

"ارے پڑھائی کے نام پر یہ سب کو سانپ کیوں سونگھ گیا۔ ابھی کھیلنے کو کہہ دیا جائے تو یہ سب آسمان سر پر اٹھا لیں مگر پڑھائی کے نام پر سب کی نانی مر گئی"

غرض کارتوس ماموں کی موجودگی اس بات کا ثبوت ہوتی کہ انھوں نے ہم سب کو ابھی ابھی ڈانٹا ہے اور پھر بس ڈانٹنے ہی والے ہیں ۔

ہمارے ایک دوست ہیں خاں صاحب وہ ہمارے جتنے اچھے دوست ہیں اتنی ہی گہری دوستی انھوں نے اپنے ماموں سے کر لی ہے ۔ وہ ہر وقت اپنے ماموں کو اپنے ساتھ رکھتے ہیں اور جہاں کسی سے وہ کوئی بات کہیں گے تو زور دینے کے لئے اسی کے ساتھ ماموں کی طرف دیکھتے ہوئے کہتے ہیں ۔

"بولو ماموں! ہے کہ نہیں!" اور ان کے ماموں "کیوں نہیں" یا "ٹھیک" کہہ کر فوراً اُن کی ہاں میں ہاں ملانا شروع کر دیتے ہیں جس کا نتیجہ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ مخاطب لاجواب ہو کر رہ جاتا ہے ۔ اور خاں صاحب کی بات رہ جاتی ہے ۔

ہمارے ایک اور دوست کے ایک ماموں ہیں اُن کا یہ قاعدہ ہے کہ ہر معاملے میں بالکل خاموش رہتے ہیں ۔ جو کام کہئے کر دیں جو بات کہئے مان لیں مگر منہ سے کچھ نہیں کہتے ۔ ہمارے دوست کی سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر ماموں ہوتے ہوئے اُن سے ان کا بھانجے والا برتاؤ کب تک رہے گا لیکن اسی کے ساتھ انھیں یہ ہمیشہ سے یقین ہے کہ ماموں جب بھی بولے ، اکٹھا بولیں گے اور اگلی پچھلی سب کسر نکال لیں گے ۔

ڈھل مل بھائی

ڈھل مل بھائی بالکل ڈھل مل یقین ہیں۔ جب وہ ہمارے ساتھ پڑھتے تھے تو انھوں نے دسویں درجے کے امتحان کی بڑے زور و شور سے تیاری کی۔ سب کو پکا یقین تھا کہ فرسٹ آئیں گے۔ لیکن امتحان دینے گیا تو کہیں نظر نہیں آئے۔ امتحان دے کر اُن کے یہاں پہونچا تو دیکھا بے خبر سو رہے ہیں۔ جگایا تو بڑی مشکل سے اُٹھے۔ امتحان کے بارے میں پوچھا تو بولے۔

"امتحان دینے سے فائدہ؟ آرٹس میں کچھ رکھا نہیں یہ دنیا اور زمانہ سائنس کا ہے۔ اس لیے سمجھو میں نے آج تک جو کچھ پڑھا وہ گدھے پر لاد دیا۔ اب میں پوری تیاری کر کے اگلے سال سائنس کے طالب علم کی حیثیت سے امتحان دوں گا۔"

یہ سن کر ہم نے سر پیٹ لیا مگر ان پر کوئی اثر نہ ہوا وہ اپنے ارادے پر چٹان کی طرح جمے رہے اور برابر ثابت کرتے رہے کہ "مجھے ڈاکٹر یا انجینیر بننا ہے اس لیے سائنس میرے لیے اتنی ہی ضروری ہے جتنا آدمی کو زندہ رکھنے کے لیے پانی اور ہوا"۔ چوں کہ مجھے اگلے پرچے کی تیاری کرنا تھی۔ اس لیے انھیں ہوا کھاتا چھوڑ کر چلا آیا۔

انھوں نے اگلے سال سائنس کے طالب علم کی حیثیت سے امتحان دیا اور فرسٹ آئے۔ اب ہم کو یقین تھا کہ وہ دن دور نہیں جب ڈھل مل بھائی ڈاکٹر، انجینیر یا سائنس داں بن کر اپنی قابلیت کی دھوم مچا دیں گے۔ لیکن جب ہم ان کے کالج پہونچے تو ہمیں یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ وہ داخلے کا فارم لیے دوڑ دھوپ میں مصروف ہیں اور "کامرس" میں نام لکھانا چاہتے ہیں۔ ہمیں کچھ پوچھنے کا موقعہ نہ دیتے ہوئے بولے "یہ عہد تجارت کا ہے۔ آج کل بزنس میں بڑی ترقی ہے۔ اس لیے میں کامرس پڑھوں گا۔"

چوں کہ ہم جانتے تھے کہ یہ حضرت بلا کے اڑیل ہیں۔ اس لیے ہماری ہمت انھیں کامرس پڑھ کر ترقی کرنے سے روکنے کی نہ ہوئی۔ انھوں نے دن رات ایک کر کے سارا کام کر لیا۔ اس کے بعد وہ ایک دن ہمیں یہ بتانے آئے کہ "میرا ارادہ وکالت یا بیرسٹری کا ہو رہا ہے۔"

میں نے کہا۔ "لیکن آپ تو بزنس میں دل چسپی رکھتے تھے"۔ بولے "دل چسپی ختم ہو چکی ہے۔ بڑے سے بڑا بزنس مین بھی وکیلوں کے

کے پیچھے مارا مارا پھرتا ہے۔ جب وکالت ہی کرنا ہے تو کام سے فائدہ، کیوں نہ بی اے کریں۔ ایک تو بی کام میں سوشل لائف نہیں دوسرے بی کام کریں پھر ایم کام کریں پھر کہیں سے پچاس ہزار روپے لا کر لگائیں تو بزنس شروع ہو اور پھر اس میں بھی آپ جانیے ہزاروں خطرے، بے پناہ کمپٹیشن، چلی نہ چلی، دیوالیہ ہونے کی صورت میں سوائے خودکشی کے چارہ نہیں۔ اس لیے بس بی اے کریں اور ایل ایل بی کریں اور کھٹ سے وکالت چمکا لیں۔"

ہم نے عادتاً ہاں میں ہاں ملائی اور کلاس میں واپس چلے گئے۔

بی اے کا امتحان شروع ہوا تو معلوم ہوا کہ ڈھل مل بھائی نے امتحان سے ڈراپ کرنے کا اعلان کر دیا۔ ہم نے وجہ پوچھی تو بولے۔

"حاضریاں کم ہیں اس لیے امتحان میں بیٹھنے کی اجازت نہ مل سکے گی۔" ہم نے پوچھا۔

"کتنی کم ہیں؟" بولے۔ "سنٹ پرسنٹ" ہم نے پوچھا۔

"کیا آپ ایک دن بھی کلاس میں نہیں گئے؟" بولے۔

"سوشل اتنا ہو گیا تھا کہ یونی ورسٹی تو پابندی سے ٹھیک وقت پر پہونچ جاتا مگر یار دوست، جلسہ، جلوس، پارٹی پالٹیکس اور کینٹین، کی بیٹھک بازی میں ایسا لگ جاتا کہ درجہ تک پہونچنے کی نوبت نہ آئی۔ یہ سن کر ہم خاموش ہو گئے۔

پھر ہم نے سنا کہ وہ پرائیویٹ امتحان دے رہے ہیں۔ پھر معلوم ہوا

کہ پڑھنا چھوڑ دیا۔

ایک دن اُن سے ملنے گئے تو دیکھا پڑھائی میں غرق ہیں۔ بڑی بے رخی سے بولے۔

"امتحان بعد آیئے گا۔" اس کے بعد انھوں نے پھر پڑھائی شروع کر دی۔ مجبوراً ہم اُٹھ کر چلے آئے۔

کچھ دن بعد نتیجہ نکلا وہ پھر فرسٹ آ گئے۔ مبارک باد دینے گئے اور باتوں باتوں میں پوچھا۔

"شاید آپ اب ایل ایل بی جوائن کریں۔؟" بولے۔

"وکالت میں کیا دھرا ہے؟ - اب میرا ارادہ کھیتی کرنے کا ہے۔"

ڈھل مل بھائی نے کھیتی کے لیے زمین کا انتظام کیا۔ ابھی وہ زمین جوتنے کے انتظامات مکمّل نہیں کر پائے تھے کہ ایک رات اچانک آ گئے اور مجھے سوتے سے جگا کر مارے خوشی کے خود بخود اچھل پڑے۔ میں نے پوچھا

"کیا ہوا؟" وہ بولے۔

"خزانہ مل گیا خزانہ" خزانے کا نام سُن کر میرے دونوں کان کھڑے ہو گئے۔ اور ایک دم سوالیہ نشان بن گیا۔ پوچھا۔ "کیا کھیت جوتنے میں کچھ نکل آیا؟" بولے۔

"کھیت؟ اوہو، اماں تم بھی کب کی بات کر رہے ہو؟ کھیتی وغیرہ سب بیکار، اب میں مچھلیاں پالوں گا۔ اور چند دن میں لکھ پتی ہو جاؤں گا۔ تمھارے پاس موٹر پر آیا کروں گا۔ سمجھے موٹر پہ!" پھر خود ہی جھینپ کر بولے

"اس وقت جلدی میں ہوں، کسی دن میرے تال پر آؤ۔ عالم باغ
میں لب سڑک ہے۔ بس اسٹینڈ کے سامنے والی کاٹیج میں مل جاؤں گا۔"
یہ کہہ کر وہ ہوا کے جھونکے کی طرح نکل گئے اور ہم سو گئے۔

کئی دن بعد ہمیں بھی ڈھل مل بھائی کا خزانہ دیکھنے کا شوق چرایا
بس سے عالم باغ پہونچے۔ دیکھا وہ کاٹیج میں لنگوٹ باندھے جھاڑو لیے
صفائی میں مصروف تھے اور ان کے چاروں طرف مرغوں کے ڈاپے،
دربے اور جالیاں تھیں۔ جن میں سے کٹ کٹ کٹاک، ککڑوں کوں،
اور چوں چوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ ہم نے انھیں اس حلیے میں دیکھ کر
پوچھا۔

"آپ کا خزانہ اور موٹر کہاں ہے اور یہ حلیہ کیا بنا رکھا ہے؟" ہنس
کے بولے۔

"اب یہی میرا خزانہ ہے۔ اور اسی میں سے موٹر برآمد ہوگی۔ مچھلیوں
کے کاروبار میں سب سے بڑا خطرہ مچھلیوں کے مرجانے کا ہوتا ہے۔ پھر
اس میں تو ہر طرح فائدہ ہی فائدہ ہے۔" انھوں نے چلتے وقت ایک درجن
انڈے ہمارے ساتھ کر دیے۔ اور گھر آنے کا وعدہ لیا۔ دوسرے دن
ہم اُن کے گھر گئے تو دیکھا کہ مکان پر انھوں نے سفیدی اور تارکول
سے خوش نما حروف میں "مرغ ہاؤس" لکھوا رکھا ہے۔ جن کے دونوں
طرف بطور ٹریڈ مارک دو اصیل مرغ اپنی چھب دکھا رہے ہیں۔ ڈھل مل
بھائی ہم سے بہت دیر تک یورپ اور امریکا میں مرغ بانی کے جدید ترین

رجحانات پر بات چیت کرتے رہے۔ اس کے بعد ہم چلے آئے۔

کچھ دن بعد ہم اُن کے پولٹری فارم پر گئے تو ایک اینگلو انڈین صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ڈھل مل بھائی نے فارم ان کے ہاتھ بیچ دیا اور اب وہ ادھر نہیں آتے۔ یہ سُن کر ہم جلے بھُنے ان کے گھر پہنچے اور اُن سے پوچھا۔

"یہ جما جمایا کاروبار کیوں ختم کر دیا؟" ہنس کر بولے۔

"پولٹری میں کیا رکھا ہے۔ میرے بھائی۔ سائیکل کے کاروبار میں بڑا نفع ہے۔ سوچتا ہوں کہ ٹائر ٹیوب کی ایجنسی لے لوں۔ یوں کئی کام ایک ساتھ ذہن میں ہیں۔ بھٹّے کے کام میں بھی اندھا نفع ہے۔ دوسرے اگر آپ کہیں سے سیمنٹ اور لوہا لنگر لے آئیں اور آپ کے پاس زمین خالی پڑی ہو تو مفت میں کوٹھی کھڑی ہو سکتی ہے۔ کیونکہ اینٹ اور مزدور تو بھٹے کے ہوں گے اور نفع گھلتے کا۔" ہم سمجھ گئے کہ اب یہ سائیکل کی ایجنسی اور بھٹّے کا کاروبار کئی مہینے تک کرتے رہیں گے۔

اس وقت تو ہم چلے آئے لیکن دو چار دن کے بعد انھیں سمجھانے کے لیے جب اُن کے گھر گئے تو دیکھا کہ پورا گھر ورک شاپ ہو رہا ہے ہر طرف سے گھرر گھرر اور کھٹ کھٹ کی آوازیں آ رہی ہیں۔ جا بجا بڑھئی لگے ہوئے تھے لٹھوں اور تختوں کے چٹے لگے ہوئے تھے۔ ڈھل مل بھائی کان میں پنسل دبائے نیکر پہنے ایک تختے پر دونوں ہاتھ رکھے مستری کو آفس ٹیبل کی نئی ڈیزائن سمجھا رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر مسکرائے

اور بولے۔
"انسان کو پیدائش سے موت تک ہر قدم پر بڑھئی کی ضرورت پالنے
سے قبر کے تختے تک پڑتی ہے۔" اس بار انھوں نے ہمیں یقین
دلایا کہ اس کام سے بہتر دنیا میں کوئی دوسرا کام نہیں ہے۔ نفع
کا کوئی ٹوٹا نہیں پھر میرا من پسند کام ہے۔" میں اس پر زور
دیتا رہا کہ "بھائی کم از کم اسی پر جمے رہیے۔"

کچھ دن بعد آفس سے لوٹتے میں ایک صاحب کے ساتھ
ایک ریسٹورنٹ میں گھسے تو دیکھا کہ ڈھل مل بھائی ہوٹل کے
کاؤنٹر پر جمے کیش میمو کاٹ رہے ہیں۔ میں نے پوچھا۔ "خیریت؟"
ہنستے ہوئے بولے۔

"آپ بھی سوچتے ہوں گے کہ بڑھئی خانے سے چائے خانے تک
کیسے پہونچے؟۔ بالکل صاف بات ہے جو نفع اور ٹھاٹھ ہوٹل بزنس
میں ہے اُن کا "وڈ ورکس" میں کہاں سے سوال نہیں" تھوڑی دیر
بیٹھ کر میں گھر چلا آیا۔

کچھ دن بعد میرا شملہ جانا ہوا۔ ہوٹل سے نکل رہا تھا دیکھا سامنے
سے ڈھل مل بھائی چلے آرہے ہیں۔ سوٹ پہنے، بو لگائے، بیگ دبائے
پائپ کے دھوئیں اُڑاتے بڑے نقشے سے ملے اور انگریزی میں خیریت
پوچھی۔ پھر کچھ وقت اکٹھا گذارنے کی درخواست کی۔ ہم لوگ ہوٹل
کے لان میں جم گئے، کافی کا دور چلا۔ باتوں باتوں میں انھوں نے

بتایا کہ ہوٹل کے دھندلے میں دھوئیں اور گند کی سوا، کچھ نہیں رکھا ہے اسی لئے انھوں نے دواؤں کی ایک بہت بڑی فرم جوائن کر لی۔ اور اس کے وہ چیف ریپریزنٹیٹو ہیں۔ طے یہ پایا کہ شام کو پھر ملا جائے اور سنیما دیکھا جائے۔ مگر حسب عادت وہ وقت پر نہیں آئے، مجبوراً اکیلا سنیما چلا گیا۔ دوسرے دن معلوم ہوا کہ انھوں نے عین وقت پر فیصلہ کیا کہ "اس وقت سنیما دیکھنے سے زیادہ لطف اسکیٹنگ کرنے میں آئے گا۔ جب رنک پر پہونچے تو بلیرڈ کھیلنے میں ایسا محو ہوئے کہ مجھ سے معذرت کرنے کا بھی ہوش نہ رہا۔ دوسرے دن جب میں گیا ان سے شکایت کرنے گیا تو وہ بیرے سے مشورہ کر رہے تھے کہ "اس وقت کھانا کھایا جائے یا ناشتہ کیا جائے؟" میں نے ان سے کہا۔

ناشتہ کا وقت ہے اس لئے میں تو ناشتہ پسند کروں گا رہا آپ کا معاملہ تو آپ ٹاس کر لیجئے۔ لیکن ٹن ٹیبل سے بھی فیصلہ نہ ہو سکا کیونکہ سکہ کھڑا ہو گیا۔ اس کے بعد پھر انھوں نے میرے لئے ناشتہ منگایا اور خود نہانے چلے گئے۔ کیوں کہ ابھی تک یہ فیصلہ نہ کر سکے تھے کہ ناشتہ کروں یا کھانا کھاؤں۔

کچھ دن بعد میں شملہ سے لوٹ آیا ایک دن حضرت گنج سے گذر رہا تھا کہ دیکھا کہ ڈھل مل بھائی کھڑے ایک عالی شان عمارت کا نیلام کروا رہے ہیں۔ پیشے کے ساتھ ساتھ اُن کے حلیہ، لباس اور شخصیت

میں بھی انقلاب آچکا تھا۔ مگر مجھے کوئی خاص حیرت نہ ہوئی۔ انھوں نے رکنے کا اشارہ کیا۔ میں ٹھہر گیا۔ نیلام ختم ہونے کے بعد بولے۔

"بھائی آپ سے ایک بہت اہم مشورہ کرنا ہے"۔ "میں نے کہا فرمائیے؟"

—— انھوں نے کتوں کا فارم کرنے اور اعلیٰ نسل کے پلّے سپلائی کرنے کے کام میں مجھ سے بہت دیر تک صلاح مشورہ کیا میں نے جل کر کہا۔

"کباڑ اور موٹر کے کام میں بھی بہت نفع ہے"۔ بولے

"ہاں ہاں! ان دونوں کاموں کے بارے میں، میں بھی بہت دن سے غور کر رہا ہوں۔ مگر فی الحال تو کتوں کا کام نفع بخش نظر آرہا ہے۔"

غرض ڈھل مل بھائی سے جب بھی ہماری ملاقات ہوئی وہ ہمیں کسی بالکل نئے کاروبار میں الجھے یا اچھے خاصے کام کو مٹی میں ملاتے نظر آئے وہ کتوں کے بارے میں مشورہ لے کر گئے اور بکریاں چراتے نظر آئے بکریوں کی توقع میں گئے تو بچہ گاڑیاں بناتے نظر آئے۔ غرض ان کا کوئی ٹھیک نہیں کہ وہ کب کون سا کام ختم یا شروع کر دیں۔
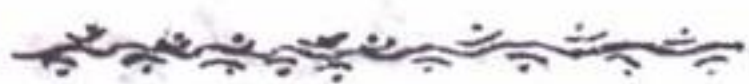
مسٹر ضرب تقسیم

میں آپ سے یہ بحث نہ کروں گا کہ مسٹر ضرب تقسیم آپ کے زیادہ قریبی دوست ہیں یا میرے مگر اتنا ضرور بتا دوں گا کہ جس وقت بھی گھر سے نکل کر، جہاں بھی جاؤں، میری ان سے مڈبھیڑ ضرور ہو جاتی ہے۔

یوں تو میرا گھر گھنی آبادی کے بیچ ہے۔ ہمارے چاروں طرف گھر ہی گھر ہیں اس لئے جتنے پڑوسی میرے ہیں شاید کسی اور کے ہوں گے ان ہی پڑوسیوں میں مثال کے طور پر لالہ جی ہی کو لے لیجئے، کبھی کبھار دکان کے سامنے سے گزرتے وقت اگر آمنا سامنا ہو بھی گیا، تو بس سامنے سے نکلتے ہی چلے گئے۔ اگر اتفاقاً نظریں چار ہو گئیں تو بے اختیار دونوں کے ہاتھ اٹھ گئے یا ایک ساتھ مسکرا دیئے۔ آٹھویں دن

یا مہینے پیچھے جمعرات کو بیٹھک بھی ہو گئی۔

بتن حجام سے آٹھویں دن ملاقات میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ اگر اس سے نہ ملیں تو آدمی کے بجائے جانور یا کمیونسٹ معلوم ہونے لگیں بیٹھے بٹھائے مفت میں ہمارے پیچھے سی آئی ڈی لگ جائے۔ حجام ہے تو کیا ہوا! ہے تو پڑوسی، اوپر سے چرب زبان، پھر معلومات میں کسی سے پیچھے، ہمارا بس چلے تو اسے جنرل نالج کے سارے امتحانات کا ممتحن ہی بنوا دیں۔ مگر خدا گنجے کو ناخن کب دیتا ہے۔

اپنے میر صاحب بھی تو آخر پڑوسی ہی ہیں۔ بھلے آدمی کا دن میں ہزار بار سامنا ہو جائے کیا مجال جو نظریں بھی ٹکرائیں، ہمیشہ شطرنج بچھائے ہر دل پر نظریں جمائے ایک سے ایک نت نئی چالیں سوچا کرتے ہیں۔

کہاں تک گنواؤں بندہ پرور! کہنے کو تو ہزاروں کی تعداد میں بھلے آدمی ہمارے پڑوس میں آباد ہیں، جن کی موجودگی کا احساس زیادہ سے زیادہ محلے میں آئے دن کی ہونے والی شادی و غمی کے موقعوں پر کچھ اس انداز سے ہو جایا کرتا ہے کہ طبع نازک پر چنداں بار نہیں گزرتا ایسے موقعوں پر زیادہ تر گھر کا بار کچھ کم ہی ہو جایا کرتا ہے۔ اکبر الہ آبادی ڈنکے کی چوٹ کہہ گئے تھے۔ ؎

پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا

مثال کے طور پر ادھر ہم گھر سے نکلے یا نکالے گئے ہوں دراصل نکالے جانے کا لفظ بیچ میں ہم نے جان بوجھ کر استعمال کر دیا ہے، کیونکہ ممکن

ہے ہم نہ جا رہے ہوں بلکہ زبردستی بھیجے جا رہے ہوں کہ جاؤ منے میاں کو ڈاکٹر کو دکھا آؤ۔" یا "بجلی کا بل دے آؤ" ادائیگی کی آج آخری تاریخ ہے ورنہ بجلی کٹ جائے گی۔" اب ہم گھبرائے گھبرائے سے دوڑے چلے جا رہے تھے۔ آپ باآسانی ہمارے موڈ کا پتہ چلا سکتے ہیں جس پر مسٹر ضرب تقسیم اچانک بجلی کی طرح گر کر اسے خاکِ سیاہ کر دیتے ہیں اور ہم چشم زدن میں جل بھُن کر کباب ہو جاتے ہیں۔ مگر صاحب بُرا ہو اس وضعداری کا۔ ہم ان سے ایک لفظ بھی نہیں کہہ پاتے۔ بلکہ اخلاقاً ہمارا بس نہیں چل پاتا کہ ہم ان کے اوپر سے اپنے آپ کو قربان کر دیں۔

مسٹر ضرب تقسیم ملتے ہی پوچھ بیٹھتے ہیں "اخاہ! جناب کہاں؟"

"کپڑے دھلوانے کے لئے دھوبی کے یہاں لئے جا رہا ہوں۔"

"ارے آپ نے بھی کمال کر دیا۔" ہم نہایت انکساری سے جواب دیتے ہیں۔ "اس بیسویں صدی میں بھی آپ ان جاہل بھارت سے پرانے دھوبیوں سے کپڑے دھلواتے ہیں آپ بھی کہاں ان کے چکر میں پھنس گئے۔ یہ دھوبی لوگ دراصل کپڑے دھوتے کم اور پھاڑتے زیادہ ہیں۔ اگر وقت پر یہ کپڑا دیدیں تو دھوبی کیوں کہلائیں۔ دیر بھی اسی وجہ سے کرتے ہیں کہ خود پہنتے اور اپنا منگا پھراتے ہیں۔ میرے والد کے کپڑے تو خیر براہ راست پیرس سے دُھل کر آتے تھے مگر اب امپورٹ اکسپورٹ کے بند ہو جانے کی وجہ سے مجبوراً ایک ان لے ڈے میں دھلا لیتا ہوں۔ آخر آپ سوٹ کی دھلائی کیا دیتے ہیں۔"؟

"اجی سوٹ کو ماریئے گولی، یہاں سرے سے سوٹ ہی نہیں

جو دھلائی کا سوال اٹھے۔"

بیگم صاحبہ کے کپڑوں کی بات دوسری ہے ورنہ خود گھر پہ ہی دھو ڈالتا آؤں۔"

موضوع یہاں ختم نہیں ہوتا بلکہ اس میں مزید باریکیاں اور نزاکتیں پیدا ہونے لگتی ہیں جن سے گریز اختیار کرنے کے لئے بہ وقت تمام راہ فرار اختیار کرتا ہوں ایسا نہ کروں تو وضعداری میں فرق پیدا ہو جائے اور لوگ کہیں، دیکھئے سر راہ فوجداری کر رہے ہیں۔

مسٹر ضرب تقسیم ایک زمانے میں ہمارے گھر میں رہتے تھے، ہمارا کھاتے ہمارا پہنتے اور اپنے گن گاتے۔ بہت جلد ہمیں اپنے عزیز پڑوسیوں سے معلوم ہونا شروع ہو گیا کہ یہ مکان جس میں ہم اپنی پچھلی تمام پشتوں سے رہتے آئے ہیں۔ ہمارا نہیں مسٹر ضرب تقسیم کا ہے۔ اگر ہماری حیثیت ایک تماشائی کی نہیں تو ایک کرایہ دار کی ضرور ہے یا مسٹر ضرب تقسیم ہماری پرورش کر رہے ہیں۔ ایک دن ہم پر یہ انکشاف ہوا کہ ہم کو مع ہمارے اہل و عیال کو چھوڑ کر غریب خانے پر ترس کھا کر ہم سے جدا ہو کر ایک بنگلے میں چلے گئے وہ بنگلے والے کہاں گئے، کچھ نہیں جانا جا سکتا اُن کے جانے کے بعد ہم پر یہ ظاہر ہوا کہ وہ ہمارے حقیقی بھائی تھے محلّے کی جن دوکانوں سے ہم نے کبھی نقد لینا بھی مناسب نہ سمجھا تھا ان کے اب اگر ہزاروں نہیں تو سینکڑوں کے ضرور مقروض تھے خصوصاً دودھ والے کا بقایا اس قدر تھا کہ شبہ ہوتا تھا کہ وہ دودھ

ہی نہیں پورا ڈیری فارم پی گئے ہیں۔ ہمارے کپڑے گھر پر موجود نہ تھے ہماری گرہستی تعداد میں کم اور مکان خالی معلوم ہونے لگا تھا۔ اور اس خالی مکان کا انھوں نے ایک مہاجر سے کئی ماہ کا ایڈوانس کرایہ بھی لے لیا تھا۔ ایک بھولا بھولا خاں بھی اکثر صبح صبح ان کی تلاش میں ہمارے گھر کے چکر کاٹتے دکھائی دیتا جو کہ حلیہ مسٹر ضرب تقسیم کا اور نام ہمارے والد کا بتاتا مگر اس کے باوجود ہماری اور مسٹر ضرب تقسیم کی ملاقاتیں بلا ماتھے پر شکن ڈالے ہوتی رہیں اور ہمارے وضعدارانہ تعلقات استوار رہے۔

ان تعلقات کو خوش گوار بنانے کے لئے ہم نے ایک اصول بنا کر اس پر عمل شروع کر دیا تھا۔ وہ یہ کہ جتنی دیر وہ ہم سے بات کرتے رہتے ہم برابر دل میں اسی رفتار سے ان کی باتوں کو تقسیم کرتے رہتے، مگر اس کے باوجود ہم کبھی کسی بات کی تہ تک نہ پہونچ سکے اور ان کے ذریعہ حاصل ہوئی معلومات کو لوگوں نے ہمیشہ شیخی ہی سمجھا۔

مسٹر ضرب تقسیم کے بارے میں یہ سوچنا کہ ان کا حافظہ کمزور ہے انکساری سے کام لینا ہوگا۔ مگر اتنا ضرور عرض کر دوں گا کہ وہ ایک بات اگر ایک آدمی سے کہتے تو دوسرے آدمی سے وہی بات کہتے وقت کچھ ایسی بات میں بات پیدا کر دیتے ہیں کہ اوّل تو وہ بات بالکل نرالی اور نئی ہو جاتی ہے۔ دوسرے گھسی پٹی بات رہنے۔ اور ایک ہی بات کو بار بار دہرانے سے سننے والے پر ایک قسم کی بوریت طاری ہو جاتی

ہے" وہ ہرگز باقی نہیں رہتی۔

اتفاق سے ایک صاحب سے انھوں نے بتایا کہ" وہ آج کل ایک کالج میں زیر تعلیم ہیں دوسرے کو اطلاع دی کہ دفتر میں ملازم ہیں تیسرے کو آگاہ کیا کہ یونیورسٹی میں پڑھ رہے ہیں چوتھے کو بتایا کہ بزنس کر رہا ہوں پانچویں کو غنڈ دیتا بتادیا کہ فارمنگ پر گذار رہا ہوں اتفاق یا شامت کہیے۔ لیجیے ایک دن ایک محفل میں پھنس گئے"، جہاں وہ پانچوں حضرات مثل چہار درویش مع بادشاہ موجود تھے۔ ایک صاحب یونہی بیٹھے بٹھائے پوچھ بیٹھے" آج آپ کالج نہیں گئے؟" دوسرے صاحب نے لقمہ دیا۔" کالج کے یونیورسٹی۔" اگر میں بھول نہیں رہا ہوں تو آپ غالباً کسی دفتر میں ملازم ہیں۔ چوتھے نے کہا۔

"کیوں؟ کیا بزنس ختم کر کے ملازمت کر لی؟" پانچویں نے عرض کیا مگر بھائی آپ تو اُس دن فارمنگ کا تذکرہ کر رہے تھے؟"

مسٹر ضرب تقسیم نے نہایت اطمینان سے پہلو بدلا۔ سگریٹ سلگائی، اور منھ ٹیڑھا کر کے ایک گہرا کش لگاتے ہوئے بولے۔

"اب آپ چاہیں کالج کہہ لیجئے یا کینگ کالج ایک ہی بات ہوئی۔ زندہ رہنے کے لئے فارمنگ کر لی ہے" بس یوں سمجھئے کہ بزرگوں سے ہوتی آئی ہے اور اس کاغذی و دفتری حساب کتاب کو الگ الگ رکھنا پڑتا ہے۔ ہے۔

یہ سارا طومار کوئی ملازمت سے کم ہے بلکہ میں کہوں گا ملازمت سے بھی بدتر ہے۔ جب اتنی محنت کرتے خون پسینہ ایک کر گے اور اس میں

سرمایہ لگاتے ہیں تو پھر اس کی نکاسی کے لئے بھاگ دوڑ کرنا پڑتی ہے اسے آپ بزنس کہہ لیجئے۔ غرض یک سر پزار سودا۔ جان آفت میں رہتی ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا کون سا دھندا چھوڑ دوں اور کون سا اختیار کر دوں۔ لشتم پشتم سب ہی چلتے رہتے ہیں۔ میاں کیا کرتے ہیں، کیا نہیں کرتے۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے یہ سب بہانے ہیں۔"

مسٹر ضرب تقسیم کے اس مکھی چوس جواب پر ہر طرف سناٹا چھا گیا اور ترک واختیار کی بات آئی گئی ہو گئی۔

یوں تو مسٹر ضرب تقسیم کی ہر چیز نرالی تھی اور ان کی اپنی ہوتی تھی مثال کے طور پر ان کی صحت کو لے لیجئے اب جو بٹنا شروع ہوئی تو گھر کے دودھ پیتے بچوں تک کی صحت پر اس کا بہت برا اثر پڑنے لگا۔ نہ کھائے جاتے نہ کوئی جم جوائین کی، نہ کبھی پہلوانی کا دعویٰ کیا بلکہ امور خانہ داری میں صرف دودھ لانے اور اسے گرم کرنے کی ذمہ داری انہوں نے اپنے سر لی تھی، لہٰذا کبھی وہ پکنے سے پہلے اُبل جاتا اور کبھی پکنے سے پہلے خشک ہو جاتا، کبھی اس کی بالائی آپ ہی آپ ایک دم خالص دودھ سے بھی بدتر ہو جاتی۔ یہ تو آپ بھی جانتے ہوں گے کہ چھوٹے بچوں کو اگر ایسا دودھ ملے جو خود بخود ڈبل کر صرف پانی رہ جائے اور وہ بھی مقررہ مقدار سے بھی کم تو پھر ان کی صحت بننے کے بجائے کچھ اور بگڑ جاتی ہے، ہمیں یاد نہیں کہ بچوں کی صحت بگڑی یا نہیں، مگر

اتنا ضرور جانتے ہیں کہ بات ضرور بگڑ گئی اور یوں کہ ایک سہانی صبح، دودھ ابلنے سے قبل ان کی مونچھوں میں تاؤ کھاتا ہوا پایا گیا۔ اور انھیں خانہ داری کے اہم شعبے سے دست بردار ہو کر اپنی صحت کو بچوں کے حق میں قربان کرنا پڑا۔ یہ ضرور ہوا مگر اس میں ان کی بننے والی صحت جس کے چاروں آنگ عالم میں شہرے تھے اور جس کے بل پر عنقریب وہ یا تو دنیا کے دورے پر پیدل روانہ ہونے والے تھے۔ یا پھر کئی دن مسلسل سائیکل چلا کر عالمی ریکارڈ توڑنے والے تھے۔ اس صحت میں ایک دم بریک لگ گیا یعنی وہ بنتے بنتے رہ گئی اور ہمارے خاندان کے اوپر سے دودھ اور ردی کی قلت ہمیشہ کے لئے ٹل گئی۔

مسٹر ضرب تقسیم جب بھی بات شروع کرتے، ایسے آدمی پر ختم کرتے جو گراں سے ملنے ہوائی جہاز پر سوار ہو کر نہیں آیا تھا تو بھی بیچارہ اپنی بساط بھر موٹر پر ضرور آیا ہوگا۔ چنانچہ اس موٹر کے تذکرے ضرور جاری رہتے رفتہ رفتہ اس آئے دن کی "موٹرز" کے تذکرے نے کچھ ایسا زور باندھا کہ ایک دن ہم نے افواہ سنی کہ انھوں نے ایک عدد موٹر خرید ڈالا ہے خرید ڈالا ہے کا لفظ یہاں پر اس وجہ سے استعمال کیا گیا ہے کہ ان کی چابی کے گچھے میں کسی موٹر والی کی تصویر کے ساتھ ساتھ ایک اور کنجی دکھائی دینے لگی جس کو وہ اپنے موٹر گیراج عرف موٹر کی کنجی بتاتے تھے۔ مگر اصرار یہ ہوتا کہ گیراج کی کم اور موٹر کی زیادہ ہے اس پر جواباً احباب کا تقاضہ ہوا کہ اگر فی الحال اگر موٹر پہ سیر نہ کروائی

جاتے تو اس کی زیارت ہی کروا دی جائے۔ ہمیں تو خیر اس سلسلے میں ناکامی ہوئی مگر دوسرے بے قدروں کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے اس موٹر کی سیر نہ سہی مگر زیارت ضرور کی ہے اور بقول ان کے ایک دم "میوزیم ماڈل" تھی اور راوی کے بیان کے مطابق گردشِ زمانہ سے اس کے پہیے غائب ہو چکے تھے۔ باڈی معدوم تھی۔ انجن کا کام آ چکا تھا۔ جہاں پر کبھی موٹر کی گدی ہوا کرتی تھی وہاں اب مکڑی کے جالوں کے درمیان بلّی نے بچے بھی دے دیئے تھے۔ اور عملاً وہ آدمیوں کے بجائے براہِ راست چوہوں کے استعمال میں تھی۔ اگر اسے دل کڑا کر کے انجن اور باڈی ڈلوا دیئے جاتے تو ایک حد تک استعمال میں آسکتی تھی اور بیل جوت کر اس سے فارمنگ کا کام بھی لیا جا سکتا تھا۔ چوں کہ اس کی مشنری اتنی پرانی تھی کہ اس ماڈل کے پرزے ڈھونڈھ نکالنا کوئی خالہ جی کا گھر نہ تھا اور موٹر کا اصلی نہ سہی عکسی ثبوت ہونا ضروری تھا۔ لہٰذا مسٹر ضرب تقسیم نے احتیاطاً اپنے کپڑوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اس کے خول میں کھڑے ہو کر ایک عدد تصویر کھنچوا ڈالی تاکہ سند رہے اور بوقتِ گفتگو کام آسکے تصویر اتروانے وقت اس میں بیٹھے اس وجہ سے نہیں کہ باوجود کوشش کے کوئی ایسی نہ دریافت نہیں ہو سکی جس پر گدی ہونے کا الزام لگایا جا سکے اس موٹر کے صبح شام کے تذکروں نے جلد ہی سماج میں خاصی شہرت حاصل کر لی اور عرفِ عام میں مزاحیہ موٹر کے نام سے مشہور ہوئی اور آخر میں اس کی کنجی برائے مول تول کباڑی کو دیدی گئی۔

اس موٹر کی خوشخبری نے بعد میں کچھ ایسے ناخوشگوار واقعات پیدا کر دیئے کہ وہ دل برداشتہ ہو کر ہمارے مکان سے اسی بنگلے میں چلے گئے جہاں ان کو آخر ایک دن جانا ہی تھا۔ اب ان کا خیال ہے کہ اب ان کے اس سابقہ مکان میں آخر آدمی کیسے رہتے ہیں اس میں تو جانور تک کا دم گھٹ جائے۔

اب بھی ان سے اکثر سرِراہ گاہے ملاقات ہو جاتی ہے۔ جس چوراہے پر وہ مل جاتے ہیں معلوم ہوتا ہے ابھی ابھی اس سے قبل والے چوراہے پر وہ ایک بہت بڑے آدمی کی موٹر سے اتر چکے ہیں۔ ان کے گلے گلے تک چائے معہ مکمل ناشتے کے ٹھنسی ہوئی ہے۔ وہ کسی پارٹی سے آ کر کسی پارٹی میں جاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وقت کی ان کے پاس کمی رہنے لگی ہے مگر ہائے رے وضعداری دبے تکلفی کہ بلا پان، سگریٹ، چائے اور تضیع اوقات کے وہ جلدی کیا دیر میں بھی مشکل ہی سے ٹلتے ہیں۔ جاتے بھی خاک ہیں بس یوں سمجھئے کہ ٹالے جاتے ہیں۔

مسٹر جوڑ توڑ

ہمارے منہ دیکھے دوستوں میں مسٹر جوڑ توڑ بھی خوب چیز ہیں ان کا نام کیا ہے۔ ہمیں کیا شاید اب کسی کو بھی یاد نہ ہو لیکن ان کو سب اس نام سے یاد کرتے ہیں اور ان کے جوڑ توڑ سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مسٹر جوڑ توڑ کو دیکھنے کے بعد آپ کو ان کی مسکین صورت پر فوراً ترس آجائے گا۔ چھوٹا سا قد، مارکین کی قمیص، ٹاٹ کا پتلون کالا چپل پہنے کھڑ کھڑیا سائیکل لئے یہ صبح سے کیریئر بنانے نکلتے ہیں ہم انہیں بچپن سے اپنا کیریئر بناتے دیکھ رہے ہیں مگر اب تک ان کا کیریئر نہ بن سکا اس کی وجہ سے ان کا مستقبل پبلک کیریئر ہو کر رہ گیا ہے جسے وہ روزانہ ڈھویا کرتے ہیں۔

مسٹر جوڑ توڑ کا خیال ہے کہ اگر ان کے دوستوں یا جان پہچان والوں میں سے کسی کا بھی کیریر بن گیا تو ان کا بنا بنایا کیریر تباہ ہو جائے گا۔ لہٰذا اس تباہی سے بچنے کے لئے وہ سب کے کیریر تباہ کرنے کے چکّر میں گھن چکّر رہتے ہیں۔ مسٹر جوڑ توڑ اس سلسلے میں بڑی بھاگ دوڑ کرتے ہیں۔

چوں کہ انھوں نے تاریخ اور سیاسیات کو مضمون کی حیثیت سے زمانۂ طالب علمی میں گھول کر پی لیا تھا اس لئے یہ تاریخ دہرانے کے لئے سیاست لڑانا ضروری سمجھتے ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے وہی پالیسی احباب کے لئے رکھی ہے جو انگریزوں نے ہندوستان میں چلائی تھی۔ یعنی ایک کو دباؤ دوسرے کو ابھارو۔ چنانچہ ان کا سارا کھیل دو کو لڑانا ہوتا ہے۔ تاکہ دو موزیوں کو لڑا کے یہ خود جھٹ پٹ نکل جائیں۔ دو کو لڑوانے کے سلسلے میں یہ ہمیشہ اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ گراؤ اور دباؤ اس کو، جس سے ان کا فی الحال کوئی کام نہ نکل رہا ہو اور چڑھاؤ اور ابھارو اس کو جس کے سہارے خود ابھرنے کا کوئی چانس نکل سکے۔ ایسا کرنے کے لئے مسٹر جوڑ توڑ جس کی تعریف کرتے ہیں اس کو۔

"آپ کا جواب نہیں!"

"صاحب آپ کا بھی دم غنیمت ہے!"

"ہم تو بس آپ کے قائل ہیں"

وغیرہ کہہ کہہ کر غبارے کی طرح پھلا دیتے ہیں اور جب ان صاحب کا دماغ یہ گیس کے غبارے کی طرح آسمان تک پہونچا دیتے ہیں تو نیچے سے کھٹکی لگانے کے لئے یہ دوسروں کے خلاف ان کو بھر دیتے ہیں کچھ دن کے بعد جب وہ اپنے کسی بالکل دوسرے کام کے سلسلہ میں کسی دوسرے صاحب کو بالکل اسی طرح چڑھا دیتے ہیں تو ان صاحب کے خلاف ان کو بھر دیتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ صاحب معاملہ حضرات میں ہمیشہ آپس میں چلتی رہتی ہے مگر وہ بھی آپس میں ایک دوسرے سے خفگی کی اصلیت نہیں جان پاتے اور مسٹر جوڑ توڑ بیک وقت دونوں کے بھلے رہتے ہیں۔

مسٹر جوڑ توڑ کی گاڑی ہمیشہ سفارش کے ذریعہ چلتی ہے اس کام کے لئے وہ اپنی کھڑ کھڑ یا سائیکل لے کر گھر سے نکلتے ہیں ان کی ڈائری میں تمام ایسے لوگوں کے نام پتے اور فون نمبر درج ہیں جن سے ان کا کوئی بھی کام نکل سکتا ہے وہ پہروں انہی پتوں پر صبح سے شام تک سائیکل کھڑکھڑاتے رہتے ہیں۔

مسٹر جوڑ توڑ کا اگر کسی سے کام نہ اٹکا ہو تو اس کے سلام کا جواب بھی نہیں دیتے۔ خواہ وہ ان کا سگا بھائی کیوں نہ ہو، لیکن اگر وہ کسی ایسے صاحب سے ٹکرا جائیں جن کو وہ جانتے بھی نہ ہوں مگر آدمی ہوں کام کے تو مسٹر جوڑ توڑ کا بس نہیں چلتا کہ وہ کیسے ان پر اپنے آپ سے قربان ہو جائیں۔

ہر بڑے آدمی کو وہ اپنا رشتے دار بتاتے ہیں اور ہر صاحب اثر انسان کو اپنا چہرہ پہچوانے کی کوشش تک کوشش کرتے ہیں جب تک کہ وہ بالکل گٹ آؤٹ نہ کر دیئے جائیں۔

مسٹر جوڑ توڑ کو شہر اور صوبے یا ملک کے تقریباً ہر اچھے خاندان کا شجرہ اور اسکینڈل زبانی یاد ہیں۔ اس معاملے میں ان کی معلومات حیرت انگیز ہیں۔ وہ اپنے ہر ملاقاتی کی خامیوں اور کمزوریوں کا پورا علم رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ ہمیشہ اس ٹوہ میں رہتے ہیں کہ انھیں کسی طرح سے معلوم ہو جائے کہ آج کل کون کس سے خفا ہے۔ جب انھیں کسی کے بارے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس سے فلاں شخص سے کچھ کھٹ پٹ ہو گئی ہے تو ان کا خوشی کے مارے برا حال ہو جاتا ہے گویا دو آدمی نہیں لڑے بلکہ ان کو چھپر پھاڑ کر دولت مل گئی اس کے بعد یہ ان دونوں سے الگ الگ خفیہ ملاقاتیں شروع کر دیتے ہیں، مگر وہ بھی اس احتیاط سے کہ ایک کو دوسرے کی ہوا نہ لگنے پائے۔ ملاقاتوں کے ساتھ ساتھ اختلاف بڑھتے جاتے ہیں اور مسٹر جوڑ توڑ کا الو سیدھا ہو جاتا ہے۔

ایسے ہی کسی موقعہ پر جب یہ دو کو لڑانے میں کامیاب ہو جائیں تو پھر ان کی پانچوں انگلیاں گھی میں ہوتی ہیں یہ دوسری بات ہے کہ کبھی کبھی سر بھی کڑھائی میں پہونچ جاتا ہے۔ مگر اس کے باوجود ہمت نہیں ہارتے۔

مسٹر جوڑ توڑ کا محبوب مشغلہ دوسروں کی بھد کرانا ہے، اسی وجہ سے ان کے قریبی حلقے ان کو غیبت ماسٹر بھی کہتے ہیں۔ ادھر چار آدمی جمع ہوئے اور انھوں نے ان تین کے علاوہ باقی سب کی برائی شروع کر دی۔ اور اگر ان تین میں سے ایک بھی اٹھ کر محفل سے چلا جائے تو بس پھر یہ فوراً اس پر شروع ہو جائیں گے

"صاحب یہ بھی خوب آدمی ہیں؟"

ایک دفعہ ایسی ہی ایک محفل میں جو لوگ موجود نہ تھے مسٹر جوڑ توڑ ان کی غیبت میں مصروف تھے لوگ جاتے جاتے اور ان کی برائیاں شروع ہوتی جاتیں اتفاق سے دو آدمی رہ گئے یعنی مسٹر جوڑ توڑ اور اُن کے مخاطب۔ ان آخری صاحب سے مسٹر جوڑ توڑ نے بہت دیر کے بعد پوچھا کہ:۔

"حضرت آپ نہیں جائیے گا۔؟"

ان صاحب نے کہا۔

"میں سب کے آخر میں جاؤں گا ورنہ میری بھی غیبت آپ شروع کر دیں گے"

مسٹر جوڑ توڑ نے کہا کہ۔

"میں ایسی آپ کی برائی کس سے کروں گا میں تو اب بالکل اکیلا ہوں۔ سب تو جا چکے۔" انھوں نے کہا۔

"دیواروں سے!" اور رجم کر بیٹھ گئے۔

ایسے ہی ایک دفعہ مسٹر جوڑ توڑ ایک نئے صاحب کو غلطی سے بالکل دوسرے صاحب سمجھ بیٹھے، تقدیر کی خرابی کہ دونوں کے نام اور صورت بھی ملتی جلتی تھی اب شامت جو آئی تو مسٹر جوڑ توڑ سلام دعا کے بعد شروع ہو گئے۔ اور راہی سے ان کی برائی شروع کر دی۔ وہ صاحب تھے ذرا ذہین قسم کے آدمی فوراً معاملے کی تہہ تک پہونچ گئے، اور خاموشی سے سنتے رہے کہ یہ کہاں تک کھلتے ہیں۔ اخیر میں جب مسٹر جوڑ توڑ اصل مطلب پر آئے تو ان صاحب نے بہت منہ بنا کر انکار کر دیا اور کہا کہ:۔

"تمہاری برائی ہمیں سے ہے"

بس اس کے بعد جو یہ سر پر پیر رکھ کر بھاگے تو کبھی ان صاحب کو پلٹ کر شکل نہیں دکھائی۔ مسٹر جوڑ توڑ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کے پیروں میں سنیچر ہے کیونکہ اتنی بھاگ دوڑ کے باوجود آج تک یہ نہ اپنی حیثیت بنا پائے اور نہ عزت۔ بڑے آدمیوں میں بیٹھ کر یہ کبھی صاحب کے پیش کار سے زیادہ نہ معلوم ہو سکے۔

مسٹر جوڑ توڑ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ کبھی کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ یہ دوسری بات ہے کہ شاید ہی کبھی ان کے کچھ ہاتھ آیا ہو۔

پیسہ کمانے کے لیے یہ ہمیشہ ہر جتن کے لیے تیار رہتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود ان کی مفلسی بڑھتی جا رہی ہے۔

ہم نہیں جانتے کہ دوسروں کا برا چاہنے والوں کا کیا حشر ہوا کرتا ہے، مگر ہم نے ہمیشہ ان کا حشر خراب ہی دیکھا۔

ان کے قریبی دوستوں کا کہنا ہے کہ مسٹر جوڑ توڑ کے خمیر میں دوسروں کو لڑانا ہے۔ لیکن لڑنے والے ایک ہونے کے ساتھ ساتھ اب اُن کو بھی سمجھتے جا رہے ہیں اس لیے اب کم ہی لوگ ان کی ہوا بھرنے اور سماں باندھنے سے متاثر ہو پاتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مسٹر جوڑ توڑ کی اب کم چل پاتی ہے اور ان کے جوڑ توڑ سے زیادہ توڑ پھوڑ نہیں ہو پاتی۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ لوگ اب ان کا نام سن کر ہی بھڑک جاتے ہیں۔ اس کے بعد یہ کچھ بھی نہیں سنتیں، مگر لوگ ان کی باتوں کو دل ہی دل میں تقسیم کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں اور ان کو چلتا کر دیتے ہیں۔

لفاظ صاحب

یوں تو آپ بھی زندگی میں ایک سے ایک لچھے دار باتیں کرنے، باتیں بگھارنے، زمین آسمان کے قلابے ملانے، دن کو رات اور رات کو دن ثابت کرنے والے، منھ زور حضرات اور خواتین سے مل اور بھگت چکے ہوں گے مگر شاید ہمارے دوست لفاظ صاحب سے آپ نہ ملے ہوں ۔ ان کا نام تو ہمیں بھی نہیں یاد لیکن اب وہ اسی نام سے یاد کئے اور جانے جاتے ہیں مگر پہلے میں آپ کو ان سے ملاقات کا آنکھوں دیکھا حال کیوں نہ سنا دوں ۔

لفاظ صاحب سے میری پہلی دلچسپ ملاقات ایک بڑی پارٹی میں ہوئی، جہاں موصوف مستقل شمع محفل بنے چمک اور چہک رہے تھے ۔ ان کی بے حد شاندار اور پرستائش، سرخ انار جیسا ہنستا ہوا نورانی

چہرہ، بالکل جدید وضع کا سوٹ بوٹ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اور کندھے اچکا کر باتیں کرنا اور بات بات پر ریشہ خطمی ہو جانا مجھے بہت بھلا لگا۔ وہ ایک ہاتھ سے موٹر کی کنجی کا گچھا گھما رہے تھے اور دوسرے ہاتھ کی مدد سے اپنی تلوار مارکہ مونچھیں کھانے کی کوشش میں چبا چبا کر باتیں کر رہے تھے۔ ہمارے میزبان نے اُن سے ملواتے ہوئے کہا۔

"آپ سے ملیے، آپ ہیں لفافا صاحب، سیدھے مدراس سے چلے آرہے ہیں۔

میں نے اُن سے متعارف نہ ہونے پر رسمی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

"آپ نے مدراس میں کیا دیکھا؟" انھوں نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔

"مدراس میں سمندر نے پہلی مرتبہ مجھے دیکھا"

اس کے بعد ہم اُن کی خود پرستی اور لفاظی کے قائل اور آپس میں گہرے دوست ہو گئے۔

اب ہمیں لفافا صاحب سے باتیں کرنے سے زیادہ اُن کی باتیں سننے میں مزا آنے لگا۔ ادھر وہ دکھائی دیے اور بھولے سے اُن سے کوئی بات پوچھ لی اور وہ ہو گئے شروع۔

ایک دن ہم مرزا غالب کا ایک شعر پڑھنے کے بہانے جھوم رہے تھے کہ اتنے میں لفافا صاحب ہم پر نازل ہو گئے اور شعر خوانی کا موڈ

اڑن چھو ہو گیا۔ وہ بولے۔

"بڑے وجد آ رہے ہیں بھئی ہمیں بھی تو معلوم ہو کہ آخر کاہے پر سر دھنا جا رہا ہے؟"

ہم نے اقبالِ جرم کرتے ہوئے اقرار کیا کہ "مرزا غالب کا شعر پڑھا جا رہا تھا۔" بولے۔

"اوہ غالب صاحب! بھئی کیا کہنا، جواب نہیں، اس کے تو ہر طرف چرچے ہیں، ہمارے تو دوستوں میں ہیں" ہم نے بڑا سا منھ بنا کر کہا۔ "کیا آپ مُردوں سے بھی تعلقات برقرار رکھتے ہیں؟۔ میرا مطلب! مرزا تو عرصہ ہوا اللہ کو پیارے ہو چکے"

نقاظ صاحب نے پینترا بدل کر بات سنبھالتے ہوئے کہا۔ "بھئی کم از کم شعر و شاعری پر بات نہ کیا کرو۔ اتنی ذرا سی بات نہیں جانتے کہ فن کار کبھی نہیں مرتا۔ مرزا نہ سہی ان کا دیوان تو ہمیشہ ہمارے پاس رہتا ہے" اور ہم لاجواب ہو کر ان کا منھ دیکھنے لگے۔ مگر وہ بڑی دیر تک ہمیں غالب کے بارے میں بتاتے اور سمجھاتے رہے، یہ دوسری بات ہے کہ اگر اُن کی باتوں میں غالب کے بجائے اقبال یا جگر کا نام دہرایا جاتا تب بھی فرق نہ پڑتا، بس ہمیں تو یہ معلوم ہو رہا تھا، کہ نقاظ صاحب نہیں بلکہ اردو کے کسی بڑے نقاد کی باتیں سُن رہے ہیں بار بار جمالیات، جدلیات، حیات، کائنات، شعور، وجدان اور آفاقی شاعری جیسے بھاری بھرکم الفاظ ہمارے کانوں سے ٹکرا اور

لفافہ صاحب ڈکار رہے تھے ۔

ایک دن ایک دعوت میں لفافہ صاحب سامعین کو یہ سمجھا رہے تھے کہ کم کھانا طبی نقطۂ نگاہ سے خودکشی کے برابر ہے، جس کے ثبوت میں انھوں نے اپنے آپ کو پیش کیا ۔ "مجھے دیکھیے کیا مجال کہ دسترخوان بچھنے کے بعد میں اٹھنے کا نام بھی لے لوں ، لوگ کھاتے کے بہانے تھوڑی بہت باتیں کرکے اٹھتے اور بیٹھتے جاتے ہیں مگر میں برابر جما رہتا ہوں ۔ کسی نے پوچھا ۔ " مگر زیادہ کھانے سے معدہ خراب ہو جاتا ہے اور بدہضمی کی شکایت رہنے لگتی ہے ۔ " انھوں نے پوچھا، حضرات آپ گاما پہلوان کی خوراک اور صحت کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ وہ چمک کر بولے ۔

" جو اپنی خوراک سے بھی کم کھائے گا وہ سینک سلائی تو ہو ہی جائے گا "

اس کے بعد وہ اٹھنے لگے تو لوگوں نے کہا : " صاحب آپ نے تو دو روٹیاں بھی نہیں کھائیں اور اٹھے جاتے ہیں ؟ "

وہ ہنس کر بولے ۔

" اٹھوں نہ تو کیا کروں، کھانا اور باتیں ساتھ ساتھ ممکن نہیں ۔ اب میرا دسترخوان تو گھر ہی پر جمے گا ۔ " اور اٹھ کھڑے ہوئے ۔

لفافہ صاحب رائی کا پہاڑ اور پہاڑ کی رائی بنانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے ۔ ایک دن ہم نے ان سے اپنی پریشانی بیان کرتے ہوئے کہا ۔ " مکان نہیں مل رہا ہے " وہ بولے ۔

"چھوڑ یار، مکان بھی کوئی مسئلے میں مسئلہ ہے، کتنے مکان چاہیئے؟"
عرض کیا۔

"صرف ایک" بولے "ایک مکان دلانا ہماری شان کے خلاف ہے۔
درجن میں بات کرو۔"

ہم نے کہا، "بھائی صاحب ایک مکان مل جائے تو بڑی بات ہے!
دوسرے آدمی ایک وقت میں ایک ہی مکان میں رہ سکتا ہے۔"

کہنے لگے۔ "اچھا بس صرف ایک مکان چاہئے ہے۔ تو سمجھو مکان تو تمہیں مل گیا، تم اپنا سامان پہلے باندھو بعد میں بات کرو۔" تھوڑی دیر بعد وہ ہنستے ہوئے چلے گئے اور ہم نے اپنا ٹیم ٹام باندھنا شروع کیا۔ شام کو وہ آئے تو ہمارا سارا سامان بندھا ہوا تھا اور باہر کھینچنے والا ہمارے حکم کا منتظر تھا۔ انھوں نے ہم سے کھڑے کھڑے موسم اور اس کے لوازمات پر ۲ گھنٹے تک اس انہماک سے بات کی کہ مکان جیسا اہم مسئلہ ہمارے ذہن سے غائب ہو گیا۔ ٹہلتے ہوئے ہم کافی دور نکل آئے یہاں تک کہ وہ ہم سے رخصت ہو گئے۔ واپسی پر ہمیں اک دم یاد آیا اور ہم اُن کے پیچھے لپکے، بڑی تلاش کے بعد وہ ہمیں ایک چائے خانے میں مل گئے جہاں لوگوں سے کرکٹ کی اس طرح تعریف کر رہے تھے کہ بے اختیار ہمارا دل مکان کے بارے میں بات کرنے کے بجائے کرکٹ کھیلنے کے لیے چاہنے لگا مگر افسوس کہ چائے خانے میں کرکٹ نہیں کھیلا جا سکتا، کمنٹری البتہ سنی جا سکتی

ہے۔ جو ہو نہیں رہی تھی۔

کافی دیر بعد غالباً وہ سانس لینے کے لیے رُکے تو ہم نے اُن سے نہایت گڑگڑا کر عرض کیا کہ "کرکٹ کی تاریخی میچوں کے تذکرے اور مشہور کھلاڑیوں کے شجرے تو آپ بعد میں بھی بتا سکتے ہیں فی الحال آپ ہمیں پھر لسبا دیجیے"۔ انھوں نے حیرت سے ہمارا منھ دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں!" ہم نے انھیں یاد دلایا کہ "آپ مجھے حکم دے گئے تھے کہ اپنا سامان باندھو، بس مکان تو سمجھو کہ تمھیں مل گیا۔"

انھوں نے ہنستے ہوئے کہا "بڑے بھولے ہیں آپ، ہم نے کہا سامان باندھو تو آپ نے سچ مچ باندھ بھی لیا، کل میں آپ سے کہوں کہ آپ کا کان کوا لیے جا رہا ہے تو آپ بجائے کان دیکھنے کے کوّے کے پیچھے لپکیں گے؟"

"تو کیا آپ نے نہیں کہا تھا؟"

"کہنے کا کیا سوال؟ ارے بھائی وہ تو میں نے تم پر طنز کیا تھا طنز، خیر کوئی بات نہیں، جیسے سامان باندھ لیا تھا۔ اب ویسے ہی جا کر کھول بھی ڈالو اور خیر مناؤ کہ تمھارے پاس رہنے کو کم از کم ایک مکان تو ہے۔ ورنہ مکان اس زمانے میں ملتا کسے ہے، کسی نے سچ کہا ہے کہ "محبوب سے ملاقات آسان ہے مگر مکان کے درشن مشکل" یہ مکان تو بہت ہی پرابلم ہے۔ صبح سے شام تک لوگ مکان کے بارے میں

پوچھتے رہتے ہیں مگر آج تک کسی نے یہ نہیں بتایا کہ "بھئی ہمارے پاس خالی مکان ہے اس کو اٹھوا دو! کیا مجال کہ اتفاق سے بھی کہیں راستے گلی، مکان کیا کسی کھنڈر پر بھی "ٹولٹ" کا بورڈ نظر آجائے کیوں صاحبان کبھی آپ میں سے کسی نے "ٹولٹ" کا بورڈ کہیں لگا دیکھا۔ ؟"

سب نے یک زبان ہو کر کہا۔

"نہیں! ۔۔ نہیں ۔" وہ بولے۔

"ہمارے بچپن میں ایک مصیبت تھی ۔ جدھر دیکھئے ٹولٹ، جدھر دیکھئے ٹولٹ غرض مکان کم ٹولٹ زیادہ، پینٹر لوگ بھی سائن بورڈ کم اور ٹولٹ کے بورڈ زیادہ بناتے تھے ۔ اگر اُس زمانے میں آپ ہوتے تو کہتے میں آپ کو ایک نہیں پچاس مکان کھڑے کھڑے دلوا دیتا۔ مگر آج کل، بس توبہ کیجئے صاحب توبہ! کہیں مکان اور ریڈھی ڈھونڈے ملتا ہے ؟"

اس پر ایک صاحب کچھ یاد کر کے ایک دم چونکے اور بولے۔

"ہاں بھلا خوب یاد آیا وہ تمھاری بھابی پوچھ رہی تھیں کہ تم نے اپنی بھتیجی کے لیے اشراف میں رشتے ناتے کی بات کی ؟"

"لفافہ صاحب بالکل انجان بنتے ہوئے بولے۔

"صاحب آپ بھول رہے ہیں ۔ ورنہ اس مسئلے پر ہماری آپ سے کبھی بات ہی نہیں ہوئی۔ ہم آپ کے دوست ضرور ہیں مگر مشاطہ!

تائی نہیں ہیں“

ہمیں سامان کھولنے کی جلدی تھی ۔ خون الگ کھول رہا تھا ۔ اس لئے ہم وہاں سے اٹھنے لگے ۔ مگر لفافہ صاحب جمے ہوئے تھے اور یہ ثابت کر رہے تھے کہ کرکٹ بھی کوئی کھیل میں کھیل ہے ۔“

رہنمائے تنقید نویسی جدید

غالباً آپ نقاد ہیں، اگر نقاد ہیں تو آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ مشہور روسی مفکر کارینکی نے اپنی معرکۃ الارا تصنیف ”لا مضراب“ میں کیا خوب کہا ہے۔ ”ہر وہ شخص نقاد ہے جو تنقید نہیں لکھتا۔“ موجودہ مقالے میں اسی قول کو بنیاد مان کر بحث کی جائے گی۔

سطور بالا سے ہرگز ہمارا مطلب آپ کو فلسفے کی ادق بحثوں میں الجھا کر مرعوب کرنے کا نہیں۔ بس ہم تو ان ہی سوالات کو اٹھائیں گے جو کلاسیکی، نیو کلاسیکی، رومانوی اور جدید مغربی و مشرقی مفکرین نے اپنے عہد میں بڑی شد و مد سے اٹھائے تھے۔ مثلاً مولانا حالی سے لے کر مولانا فروغ تک کے زمانے میں برابر یہ سوال اٹھتا رہا۔

”مبتدی، تنقید لکھنے میں آخر کیوں ناکام رہتے ہیں؟“۔

چار دن میں ان کی شہرت آسمان پر کیوں نہیں پہونچ جاتی ؟
فن کاروں کے یہاں سے دودھ، دہی اور مکھن ان کے یہاں مفت کیوں نہیں آنے لگتا ؟ ۔
نئے لکھنے والے انھیں کیوں نہیں جھک جھک کر سلام کرنے لگتے ؟ ۔
ان کا اپنا ایک حلقہ کیوں نہیں بن پاتا جو تمام عالم کو اپنے دام میں اسیر کرلے ؟ ۔
جلسہ، جلوس و ہنگاموں کے موقعوں پر ان کو کیوں نہیں یاد کیا جاتا ؟
مشاعروں، کانفرنسوں اور مناظروں میں انھیں کیوں نظر انداز کیا جاتا ہے ؟
آخر ان کا نام لیتے ہوئے لوگوں کے منہ نہیں تھکتے ؟
شکسپیر نے "ہوطیقا" میں دراصل "مین اینڈ سوپر مین" کے کردار میں ان ہی پرچھائیوں کو اسیر کرنے کی کوشش کی ہے ۔ جو آخر میں ایک بہت بڑا سوالیہ نشان بن کر ہمارے سامنے اسیر ذات بن کر آجاتا ہے۔
بالغرض ہم اسے نقاد کامل بھی مان لیں ۔ جیسا آخر میں مولانا ارم نے کیا تھا۔ تو ہمارے سامنے دوسرے ضمنی مسائل آجاتے ہیں ۔ مثلاً ۔
اچھا نقاد کسے سمجھا جائے ؟
تنقید نگاری کسے کہتے ہیں ؟
نقاد کسے کہیں گے ؟ ۔ تنقید لکھنے والوں کو، یا تنقید کرنے والوں کو ؟
" ہماری ناقص رائے میں ہونہار اور ابھرتے ہوئے نقادوں کو

تقریباً دو باتیں اپنی گرہ میں باندھ لینا چاہیے۔
اول نقاد بننا۔ دوئم تنقید کرنا۔

نقاد بننے والے نوجوان پر لازم ہے کہ وہ اپنے شہر کے کم ازکم اس کافی ہاؤس میں زیادہ سے زیادہ وقت ضرور گزارے جہاں شہر کے انٹلیکچول جمع ہوا کرتے ہوں۔ ٹی۔ ایس ایلیٹ نے کیا پتے کی بات کہی ہے " دوسروں پر سب سے بڑی تنقید دراصل اُن سے کافی پینا ہے اور جو تنقید شروع شروع میں نہ کر سکے وہ تنقید سہہ تو سکتا ہے خواہ اس کے لیے اُسے کتنی زیادہ سے زیادہ کافیاں پلانی پڑیں۔ اور جس کے بلا نوجوان علم مجلس سے بے بہرہ رہے گا " چوں کہ ہمارے یہاں خوش قسمتی سے تنقید کی کوئی اپنی تھیوری نہیں ہے اور علمی تنقید کی فراوانی ہے۔ اس لیے نوجوان کو علمیات سے فارغ ہونے کے لیے زیادہ سے زیادہ وقت کافی ہاؤس و چائے خانوں کے اجتماع میں گزارنا چاہیے جہاں بہت جلد وہ مغربی مفکرین ان کے کارناموں، ادبی تحریکوں، عالمی ادب وغیرہ کی فہرستوں اور ناموں و اعداد وشمار سے کماحقہ واقف ہو جائے گا۔ جس کے بغیر پڑھے لکھوں کے درمیان زبان کھولنا ممکن نہیں۔ مبتدی کے لیے لازم ہے کہ وہ سقراط و بقراط اور جالینوس سے لے کر کلیم الدین احمد تک سب کے افکار و خیالات پر سخت سے سخت تنقید کرے اور ہرگز ہرگز کسی کو خاطر میں نہ لائے۔ ورنہ اسکی علمیت مشکوک تصور کی جائے گی " کس نے کیا لکھا ہے ؟ " نہیں "

بلکہ کسی نے کچھ نہیں لکھا ہے " جب تک وہ عمل پیرا نہ ہوگا ۔ فن کار ہرگز نہ چوکیں گے ۔ ساتھ ہی نوجوان کو "آداب محفل" کا پورا خیال رکھنا چاہئیے جہاں بات اردو میں ہو رہی ہو ۔ وہاں درمیان میں اس کو انگریزی ضرور بولنی چاہیئے اور اس کے سارے حوالے عالمی فلسفے کی تحریکوں کا نچوڑ ہونا چاہیئے ۔ اور جہاں بات انگریزی میں ہو رہی ہو ۔ وہاں اس کو ہندی اور سنسکرت سے مدد لینی چاہیئے ۔ "چارواد" اور "شنکر" کے اعلیٰ خیالات سے سامعین کو محظوظ کرنا چاہیئے ۔ اس کی اس بیک گراؤنڈ کو سمجھنے میں آسانی ہوگی ۔ ویسے اگر وہ اینگلو انڈین حضرات کی موجودگی میں اردو بولے تو اس کی ادبی حیثیت پر کوئی آنچ نہ آئے گی اور وہ بھی شیکسپیئر اور گوئٹے سے اتر کر میر و غالب تک آجائیں گے ۔

نوجوانوں سے سنجیدگی اور بصیرت کا کسی وقت بھی مطالبہ کیا جا سکتا ہے ۔ جس کے لیے ضروری ہے کہ وہ قلم اٹھانے سے قبل ایک نہایت سنجیدہ موٹے تالوں والی عینک ضرور استعمال میں لائے ۔ جس میں سے وہ سب کو دیکھ سکے ۔ مگر دوسرے اس کا رخ نہ سمجھ سکیں ۔ شیشے بے حد گہرے سیاہی مائل ہونے ضروری ہیں ۔ ورنہ دوسروں کو آسانی سے نظر انداز نہ کر سکے گا ۔ اور اس کی راہ میں طرح طرح کے اصولی دقیق کھڑی ہو جائیں گی ۔ نقاد کو لازم ہے کہ وہ اپنی روزمرّہ کی زندگی میں بے حد لیے دیے رہے ۔ سنجیدگی سے بات کرے ۔ ہر بات قدیم یونان (اور اگر جماعت اسلامی سے تعلق رکھتا ہے) یا حضرت آدم سے شروع کرے ۔ دور سے دیکھنے والا

اسے کم از کم ایک کڑک مرغی ضرور سمجھے۔ گھر سے نکلتے وقت ہمیشہ اس کے ہاتھوں میں قدیم لاطینی یا انگریزی زبان کا کوئی نایاب نسخہ ہو۔ جس پر ان دنوں وہ ریسرچ کر رہا ہو اور اس نے آنکھ بند کرکے سُرخ پنسل سے اسے گودا ہو۔ کتاب کے سارے ورق کٹے ہوئے ہونا چاہیئے۔ ورنہ اس کا کسی وقت بھی اسکینڈل بن سکتا ہے۔ اس کی زبان پر جلد غیر مطبوعہ و زیر طبع کتب کی تفصیلات ہوں۔ ہر وقت بے حد عجلت میں رہتا ہو۔ جس کے اظہار کے لئے ایک عدد رسٹ واچ کا ہونا بے حد ضروری ہے۔ بلا بلائے ہرگز کہیں نہ جاتا ہو مگر جانے اور بلائے جانے کے ہتھکنڈوں سے اس کی واقفیت از حد ضروری ہے۔

نقاد کے لیے ضروری ہے کہ وہ جلد از جلد فیصلہ کرے کہ وہ اپنا کعبہ کہاں بنائے گا۔ کعبے میں روس یا امریکہ و افغانستان ہیں۔ پھر اسی کے مطابق اس کو بات شروع کرنے سے قبل تمہید باندھنی ہوگی کہ کون کہتا ہے؟۔

الغزالی کہتا ہے
یا گورکی کہتا ہے
یا آئین شٹائین کہتا ہے
یا شا کہتا ہے۔۔!

کیوں کہ یہ خود نقاد بھی جانتا ہے کہ کبھی خود اسے کچھ نہ کہنا ہے اور نہ وہ کہے گا۔ ایسا کرنے سے ایک تو وہ رواجِ عام سے ہٹنے کے سبب

متروک نہ ہوسکے گا۔ دوسرے اس کی پوزیشن خاصی مضبوط رہے گی۔ اور اس کی پشت پر اس گیٹ کے سارے حاجی بھی رہیں گے۔ جن کا رسہا اس کی ادبی شان برقرار رہنے کے لیے ناگزیر ہے اور اس طرح اس کی حیثیت بہت جلد ہی مقامی سے بین الاقوامی حیثیت اختیار کریں گے جس کو اسکی ترقی سمجھا جائے۔

جب نوجوان بہ حیثیت نقاد کے پہچانا جانے لگے اور بعض زبانوں میں وہ لکھنے کے لیے تمہید باندھ رہا ہے اس کے سوا دوسری زبانوں میں خود بقول اس کے اس کی تحریروں کے تراجم مضامین وکتب کی صورت میں شائع ہونے لگیں۔ تب نوجوان پر لازم ہے کہ وہ اپنی زبان میں لگا ہے قلم اٹھائے۔

قلم اٹھانے سے قبل وہ اس بات کا اچھی طرح سے اندازہ کرے کہ جس پر وہ قلم اٹھانے جارہا ہے اس میں مندرجہ ذیل خصائص میں سے کسی کے جراثیم بھی ہیں یا نہیں؟ (اس کے اس فعل کا شمار تنقید کرنے میں ہوگا) یعنی۔

فنکار خاندانی بھی ہے یا نہیں۔!

صاحب حیثیت و ثروت ہے یا نہیں؟

اس کا سلسلہ سادات حاتم طائی سے ملتا ہے یا نہیں؟

وہ کسی اعلےٰ ترین عہدے پر ممتاز ہے یا نہیں؟

وہ ریڈیو، سرکاری اخبار، رسائل، انعام وکام دینے والے اداروں

منسلک ہے یا نہیں ؟

نوجوان سے اس کی رشتے داری یا دوستی ہے یا نہیں ؟

اس پر قلم اٹھانے کا معقول صلہ اسی دنیا میں مل بھی سکے گا ؟۔

یا نوجوان کو آخر میں غالب والی شہرت خشک کا شکار ہونا پڑیگا۔

اس پر قلم اٹھانے سے براہ راست نقاد کے کیریکٹر پر اچھا اثر پڑیگا یا نہیں ؟۔

وہ نقاد کا ہم وطن ہے ؟ پڑوسی ہے ؟ گھر میں رہتا ہے ؟ محلے دار ہے ؟ ہم مذہب یا رشتے دار ہے ؟

اوپر دی ہوئی شرائط کو اگر فنکار پورا نہ کرتا ہو، تو خواہ مخواہ نقاد کو اس پر قلم اٹھا کر اپنی ساکھ ہرگز نہ گرانی چاہیئے۔

نقاد کو اس بات پر بھی نظر رکھنی چاہئے کہ فن کار پر سب مل کر لکھ رہے ہیں کہ نہیں ؟۔ اگر اس پر لکھنے کا اس عہد میں رواج عام نہ ہو تو اس پر قلم اٹھانا روایت سے بغاوت تصور کیا جائے گا۔ جس کا اثر فن کار سے زیادہ خود نومولود نقاد کے کیریکٹر پر پڑے گا۔ جس سے شروع میں پرہیز اور آخر میں احتیاط لازم ہے۔

فن کار پر قلم اٹھانے سے قبل یہ طے کرنے کے لیے اس مقابلے میں اس کی تعریف کی جائے یا تنقید۔ بجائے موضوع کے نقاد کو فنکار کی شخصیت کا احاطہ کر لینا لازم ہے۔

اگر نقاد کو اب تک اس مخصوص ادارے نے نظر انداز کیا ہے۔

جس سے فن کار وابستہ ہے تو پھر بنیادی طور پر فن کار کی گہرائی لازم
اور اگر فن کار اس پر بھی زیر نہ ہو تو نقاد کو لازم ہے کہ اس پر مضامین
کا طومار باندھ کر اس کے خلاف بحث چلوا دے۔

وسعتِ نظر و مطالعہ کے لیے لازم ہے کہ نقاد اپنے زمانے کے ادب
کا بہت گہرا مطالعہ کرے اور تحلیلِ نفسی کے ذریعے ان موضوعات کی روح
تک پہونچ جائے، جس کی تحریک پر وہ قلم اٹھائے گئے تھے۔ اور یہ جاننے
کی کوشش کرے کہ ہم عصر ناقدین نے اپنے ہم عصروں پر جو تنقیدیں
کی ہیں۔ ان کی روح میں تہہ در تہہ وہ کون سے اغراض، منصب،
مفاد وابستہ ہیں جن کو نئے انداز سے وہ خود اپنے احباب و سرپرستوں
کے سلسلے میں استعمال میں لا سکتا ہے۔

اس گہرے مطالعے و مشاہدے کی مدد سے اُن کو ان کا اسلوب
پہچاننے میں بڑی آسانی ہوگی اور وہ خانے بھی سمجھ میں آجائیں گے جن
کے باہر تنقید کی تلاش بے سود و بے مقصد ہے اور آپ کو بھی ان ہی
مفروضوں کو بنیاد مان کر آگے بڑھنا اور پھیلنا پھولنا ہے!۔

مگر کسی کے اسلوب کو اپنانے کے چکر میں ہرگز نہ پڑیے، کیونکہ
ہمارے یہاں کسی کا کوئی اسٹائل نہیں۔ اور نہ مغرب کا کوئی ذکر۔
بس آپ جو کچھ لکھ دیں گے وہی آپ کا اسٹائل سمجھا جائے گا۔ جس کے
لیے شروع میں آپ کو فری اسٹائل مشقوں کی بے حد ضرورت ہے
اور رہے گی۔

قلم اٹھاتے وقت طے کر لیجیے کہ آپ کو لکھنا ہے۔ اس چکر میں نہ
پڑیے کہ آپ کیا کہتے ہیں۔ کیونکہ آپ کبھی بھی کچھ نہ کہہ سکیں گے۔
بلکہ یہ دیکھیے کہ مغربی مفکرین کیا کہتے ہیں۔ اور مغربی مفکرین نے
جو کچھ کہا ہے وہ آپ کو Book of Quotations میں مل جائیگا
مواد کی فراہمی کے سلسلے میں آپ کو لائبریری سے مدد لینی چاہیئے۔ اور
اس موضوع پر آپ کو جس قدر کتب و رسائل مل سکیں اکٹھا کر لیجیے
اور پھر اکٹھا بیٹھ کر مقالہ ترتیب دیجیے۔ جس میں کہیں آپ دوسروں
سے اختلاف رہا کہیں اور کہیں آپ کی اپنی زبان ہو۔ اپنا کاغذ
قلم و سیاہی تاکہ آگے چل کر وہ اس پر بھی آپ کی اپنی سمجھی جاسکے
آپ کے سارے اختلافات ذاتی ہونا چاہیئں، تنقید میں نہ اصولی
اختلافات کی وقعت ہے اور نہ کبھی ہوگی۔

جو فن کار آپ کی تحریروں پر مایوسی کا اظہار کریں ان میں سے اگر
کوئی اہم فن کار ہے تو اگلے مقالے میں آپ یا تو اس کو نظر انداز کیجیے
ورنہ اس کے زوال کے اسباب سے بحث کیجیے۔ اور پھر دیکھیے کہ وہ آپ
سے اب مایوس زیادہ ہے یا پُرامید۔!

شروع میں لوگ آپ کو نصف بہتر اور گھوڑے کی مکھی وغیرہ
جیسے ناموں سے یاد کرنے کی کوشش کریں گے۔ مگر آپ کو ذاتیات
سے بلند ہونا چاہیئے۔ ورنہ اگر آپ ذات کے خول میں اسیر ہوکر رہ
گئے تو کبھی آگے نہ بڑھ پائیں گے۔ اس لیے بہتر ہے کہ آپ شروع میں

نام و نمود۔ لیکی، بدی، خوشی، ناخوشی کے چکر میں نہ پڑیں۔ بلکہ سنجیدگی سے کسی نہ کسی حلقے میں داخل ہو جائیں۔ اور وہ حلقہ آپ کو جدھر بھی لے جائے چلے جائیں۔ اس میں آپ کو فائدہ یہ ہوگا کہ شروع ہی میں آپ کو ایسے بہت سے حضرات و خواتین مل جائیں گی جو اپنی پہلی فرصت میں آپ کی عظمت تسلیم کر لیں گی۔ اس موقعہ پر جو بات آپکو بھی ان سب کی عظمت کا تحریری اعتراف وقتاً فوقتاً کرتے رہنا چاہیئے عظمت کے سلسلے میں آپ کو سطحی مطالعے کے بعد ہی پتہ چل جائے گا کہ ہمارے یہاں کس کی عظمت تسلیم کرنے سے کس کو کیا ملا۔ خصوصاً کتاب کا انتساب کرتے وقت آپ اپنے شعبے کے صدر، استاد، حاکم وغیرہ وغیرہ کو ہرگز نہ بھولیے کیونکہ یہی وہ صحیح لوگ ہیں جو آگے چل کر آپ کی تحریر میں خوبیاں تلاش کر لیں گے۔ ورنہ آخر آپ اپنے منھ سے کہاں تک اپنی تعریف کر سکیں گے!۔

تنقید کے سلسلے میں ایک بات اور یاد رکھنے کے قابل ہے کہ شروع میں آپ جیسا بھی لکھیں اور جہاں بھی لکھیں مگر آخر میں آپ کو محتاط ہو جانا چاہیئے کہ آپ بہت کم لکھیں، اگر لکھنا ہی پڑے تو زیادہ سے زیادہ دیباچے مقدمے اور ریڈیو ٹاک وغیرہ لکھے جائیں۔ ان سے رہنمائی اور سرپرستی کا براہ راست اظہار ہوتا ہے اور شخصیت کا بھاری بھرکم پن بھی باقی رہتا ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ اگر ہماری بتائی ہوئی ترکیب پر تنقیدی حضرات

نے دس فی صدی بھی عمل کر لیا تو وہ دن دور نہیں جب وہ اپنے عہد کے سب سے بڑے نقاد تسلیم کر لیے جائیں گے اور شہرت و دولت ان کے قدم چومے گی۔

مگر آخر میں ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ ایک بار آپ کو پھر یاد دلا دیں کہ سب کچھ بھول جائیے گا۔ مگر برائے خدا "چونکانا" نہ بھولیے گا۔ جو نقاد چونکا نہیں سکتا وہ کبھی کچھ نہیں کر سکتا۔ اب یہ آپ کے اوپر ہے کہ خواہ آپ حقیقت کو باطل کر کے چونکائیں یا باطل کو حقیقت کر کے، بحث چلا کے یا کانفرنس کر کے، جمود کا نعرہ لگا کے، یا ایک دم لکھنا پڑھنا چھوڑ کے۔ مگر چونکائیں ضرور۔ اس سے آپ کو فائدہ ہوگا اور ہماری رہنمائی بھی آپ کی تنقید نویسی میں ٹھکانے لگ جائے گی

ہو الشافی ۔!

گلیمر بوائے کا خط

قرۃ العین حیدر کے نام

از کیتھے ڈی پھوس ایمٹی ہاؤ سنر، (پیرو ڈی)
چھرلوٹیا کو ارٹرز سلم ایریا، لکھنؤ (اودھ)

پوم پوم ڈارلنگ!

امید ہے کہ اس وقت آپ مع اپنے تمام سفید خرگوشوں، بھورے چوہوں اور ایرانی بلیوں کے ساتھ خیریت ضرور اودھ جیم خانہ سیڑوبے کلب، روشن آرا کلب، محمد باغ کلب، فلائنگ کلب، چھتر منزل کلب، میرس کالج اذابیلا، تھوبرن کالج، کیننگ کالج، شانتی نکیتن، لکھنؤ یونیورسٹی، کرواہاراج، امیرپور ہاؤس، گورنمنٹ ہاؤس، لالہ رخ، وائی، ڈبلو۔سی۔اے ہاؤس، گورنمنٹ، ٹبلو پیلس، وائلڈ فلاور ہاؤس، کائیڈر روڈ، کاسلس روڈ، مال ہینٹ ہال، مسوری،

ہوٹل۔ کانٹینینٹل، نیو انڈیا، میٹروپول، دل کشا، حضرت گنج، نائٹ آئی دی کورٹ اور شیشے کے گھر کے نہال خانوں میں کہیں دکھیں پاکستان میں ضرور ہوں گی۔

جہاں بلاشبہ اس وقت سرخ چٹانوں کے پیچھے بہار کا نارنجی آفتاب طلوع ہو رہا ہوگا اور کوہستانی پھولوں کی مہک پر سرخ قالین والی گیلری سے سفید فام ارمنی لڑکیاں معہ اپنے سرخ بالوں والے بچوں کے رنگین سنگ ریزوں سے اس خدا کی بستی میں کھیل رہی ہوں گی۔ ہر طرف سکون ابدی، سکون لامتناہی خاموشی، اچانک کسی خواب آگیں سحر سے ٹکرانے کی ابتدائی تیاریوں میں مصروف ہوگی۔ قریب ہی سوئمنگ پول کے سامنے ہوٹل کی رقص گاہ میں ڈانس کے بینڈ پر پورچ کی مدھم روشنی میں چقندر کی ایسی ناک والے موسیلو شو مین کا کار نیوال بج رہا ہوگا۔ باہر جانب سفید برساتی مشروم کی طرح آپس کے گرد بیٹھے ہوں کے نیچے فورسس بینڈ بنگ کرتے والے نیلی ڈسپیٹر سے اترے سیاہ آنکھوں والے مغرور ہندوستانی راجواڑے جن میں ——— اسرپور راج بالور اعظم، شاہی نکیشن، حفیظ، سیعد بر جیندر کمار روستی، سید افتخار کو تھا عرفان علی بیچو، پرانڈو ن دانا لو، لوز، پوپو، ٹوٹو، اور دوسرے بہت سے رفاعیت بلبط نوو، لیتے پروفیسر وغیرہ جیسے شرافت کے تعمیے عرض سارے کرکٹ جھنڈی مار اور دوسرے سپر بیج ہندوستانی واپس آنے کے بعد کسی سینئر ڈیرے کلب کے پہلے ڈنر پہ جمع ہوں گے، جن کی سامنے والی

کرسیوں اور صوفوں میں دھنسی ہوئی عتّافی، بالوں والی امریکن لڑکیاں روشنی ڈارلنگ، سلطنت آرا بیگم، زخشندہ بیگم، کرسٹابل، گھنی ذول منارکا، ڈائمنڈ، عالیہ باجی، لیلیٰ ملگرامی، جگیم عرفان احمد زینت ریاض شہلار حمان، اکنور رانی اور ڈورتھی جیسی سیڈ ہیڈ ہیڑ سہ پارٹی برا جمان ہوگی۔

اور دور کہیں دو راق کے پار لاؤنج کے سرخ پردوں سے پرے آتش دان کے قریب سنگ مرمر کی میز پر بقول آپ کے صبح کی ہوائی ڈاک میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ ٹی روم کے ستونوں کے پیچھے سرخ قالینوں پر بال کے دبیز گدیلوں کے درمیان بے کراں تاریکی میں میں اکیلا بیٹھا اپنے صوفے پر چائے کی پیالی میں چمچا بجاتا ہوں گا۔ میرے اوپر بیٹھے بٹھائے یک محنت زندگی کے سارے آثار پیدا ہو چکے ہوں گے اور میں اٹھ کر ریڈیو پر دنیا کے سارے اسٹیشنوں کو ٹیون کرنے لگا ہوں گا ہالی ووڈ کی تازہ ترین دُھنیں تقریباً مجھے سراسیمہ کر چکی ہوں گی۔ او گوش! مجھے سیاہ آنکھوں والا پر اسرار مغرور ہندوستانی گلیمر بوائے جو ابھی ابھی دوبارہ دھم سے صوفے پر بیٹھ چکا ہے اور جلد ہی صوفے کو خدا حافظ کہہ کر یونیورسٹی اسٹائل سے جا کر اپنے مشہور و معروف موٹر کی اسٹیرنگ وہیل پر بازو رکھ کے چپ چاپ سگرٹ پی رہا ہوں گویا ابھی گیلری کانفرنس سے واپس پلٹا ہوں، لیجیے اب میں باقاعدہ ایک پبلک پارک کی کیاریوں میں تتلیوں کا پیچھا کر رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے

اس دوران چاکلیٹ کھا کر فلسفۂ حیات پر بحث کرنے لگیں اور جلد ہی
اس سے اکتا کر نہایت سنجیدگی سے سب کی لائف انشورنس کمپنیوں کے
پتے نوٹ کرنے لگوں کہ مشغلہ بُرا نہیں۔

اور میں جو ابھی ابھی عرض کر چکا ہوں کہ بے حد سُپر انٹلیکچول
ورسٹائل قسم کا جینیئس ہوں اور بڑے بوہیمین انداز سے ہیرس پارٹی
کے درمیان بیٹھا باری باری سب کی پیالیوں میں چمچے بجا کر جلترنگ
کا مظاہرہ کر رہا ہوں۔ ہوا نہ ہوگی۔ ہینڈسم لسٹ پہ بغیر کسی
کمپٹیشن کے میں واحد سُپر ڈسٹنگوئشڈ گلیمر بوائے ہوں، یعنی بہت ہی
پالشڈ قسم کا ——— میری رونلڈ کولمین ٹائپ کی مونچھیں جن کی دائیں
نوک پہ آج کل اپنی ساری توجہ صرف کر رہا ہوں۔ اس تھکا دینے
والی یکسانیت سے اکتا کر ابھی میں دریچے سے باہر کود کر باغ والے
کمرے میں واپس چلا جاؤں گا۔ باغ جس کے کورٹ میں اگر ذرا بھی
رک گیا تو پھر تو وہ میری گرینڈ اور بارڈس پرسنالٹی (جو آپ کی
اطلاع کے لیے مردانہ وجاہت کا بہت ہی ٹھوس ثبوت ہے) بیڈمنٹن
ٹورنامنٹ کے غل غپاڑوں میں کھو جائے گی۔ اور میرا صندلی گرم
تبسم امتحانی نیچ لیتے ہوؤں سے ٹکرا کر میرے وجود کو پاش پاش
کر دے گا۔ جیب سے نکل کر کافی ہاؤس، ٹیکرس، پوکیٹس، کے
مخفف انٹلیکچول خرٹ اور گیا سٹک مل جل کر مثل زرد پتوں اور
گردے یگولور کے میری زندگی کی مقناطیسی رو کو جو میں کبھی کبھی سبق

یاد کرنے میں لگا سکتا ہوں۔ وقت کے ریگستانوں میں کھو دینے کے اسکوپ پر رقصاں ہو جائیں گے اس وقت میرا ایسا سنجیدہ اور مغرور انسان اپنے آپ کو کس قدر بے وقوف اور احمق محسوس کرنے لگا۔ ہو سکتا ہے کہ چار منٹ ان کو کبھی اس وقت مجھے اپنی جانب متوجہ نہ کر سکے اور میں انتقاماً بڑی کاہلی سے ایک طرف کو آرام کرسی پر بیٹھا سگریٹ پیتا رہوں گا۔ جس کے درمیان یقیناً تازہ ترین اسکینڈل اپنے امکانات پر غور کرتے کرتے چپکے سے غرّاؤں گا۔ بالکل میٹر آف فیکٹ قسم کی غراہٹ جس کو خواہ آپ کنفیوژن ازم کہیں یا ایموشن اور خرگوش کی طرح پھولا رہوں گا ایک دم موٹا اور گنڈا اور لڑکے کی طرح محض خواتین کو شوک پہونچانے کی خاطر کیونکہ میں جو گلیمر لوائے ہوں جس کا مجھے رنگیلی بہت سختی سے احساس ہے کیونکہ یونیورسٹی کے سارے پچھلے ریکارڈس کھٹا کھٹ توڑ چکا ہوں۔ اور میں اتنی سی بات پر مجھے دیکھتے ہی اچھی خاصی لڑکیوں کے ہارٹ فیل ہوتے ہوتے رہ جاتے ہیں۔ اور میں ساری لڑکیوں کی ماؤں کے لیے ایک مستقل موضوع گفتگو کی حیثیت اختیار کر چکا ہوں۔ اور بے حد اسمارٹ طریقے پر زندگی گزار رہا ہوں اور بے حد گلیمنٹ ڈیشنگ رسس ہوں۔ رنگیلی فارمی لائف از وری نئی اینڈ اسٹرٹیننگ ـــــ اکثر اکسائیٹمنٹ کے لیے نہایت فینٹک طریقے سے پبلک میں قلابازیاں کھانے کی مشق بھی کر لیتا ہوں۔ لیکن جب

اگر اس میں بھی آپ اپنی موربڈیٹی کی وجہ سے پوری طرح محسوس کر رہیں تو اس
کی گارنٹی نہیں کیونکہ ایسے موقعوں پر پبلک کے لیے مرنے اور بور
ہونے کی خواہش بے حد عام اور بے وقعت چیز ہے جس کے باوجود
میں گلیمر ہولڈر ہوں۔ لڑکا مرغا ہمیشہ گھر میں بے حد شور مچاتا ہوں کہ
سے میری دانست میں سب پہ بڑا نفیس امپریشن پڑتا ہے۔ آپ کر
اپیل کرے یا نہیں —— میں سوچتا ہوں اسی طرح ہم میں سے ہر
ایک کو اپنی مرضی کو طاق پر رکھ کر خوابوں کے ساحل پر جا کر زندگی
سے صلح کر لینا چاہیے۔ ورنہ زندگی کے فیلا فزیکل سائے آپ کو محض
پروفیشنل طور پر انسان بن کر زندہ رہنے پر مجبور کر دیں گے۔ اور
یہ ٹراجیک شخصیت آپ کو جینے نہ دیں گی اور آپ یہ سوچنے پر مجبور
ہو جائیں گے کہ آپ کے سامنے کوئی مستقبل نہیں آپ کے پیچھے کوئی
ماضی نہیں۔

مثال کے طور پر شفق کے اس اُجالے میں آج میں جب اپنے مخصوص
اکسفورڈ اٹھائے حسبِ معمول گھر سے امپلائمنٹ ایکسچینج کی طرف
چلا تھا تو مشرق کا تارا آگے آگے میری رہنمائی کر رہا تھا۔ گھاس پر
سے ہوا اُڑتی ہوئی گزر رہی تھی۔ دور کہیں خلاؤں میں مسوری کی
روشنیاں جھلملا رہی ہوں گی جن کے ساتھ ایک ماضی وابستہ ہے اور کچھ
اسی قسم کا رومان —— روزگار کے دفتر کی ایلزبیتھن وضع کی دو منزلہ
عمارت جیسا کی مشہور دلفریب دیوار سے کسی بے روزگار کی طرح آ لگی ہوئی

چپکی ہوئی ہے طنبوروں کے جھنڈ، سیمنٹ کے شگوفے، جن پر گلابی چونچ
والا لاکا کا تو ہمیشہ شور مچاتا رہتا ہے۔

عرض تم نہیں جانتیں کہ پوم پوم ڈارلنگ یہاں کیا ہوتا ہے! لہٰذا
مجھے گھانس پر بیٹھ کر رونے دو۔ کیوں کہ میں مرزا پور اور دیوریا جیسی
خوفناک جگہوں، نجم الدولہ باؤ نا اور اپنے باپ کے گھر کی مشترکہ دکنی
سفید سیڑھیوں پر نہایت کاہلی سے بیٹھ کر سگرٹ کے دھوئیں کو غور
سے دیکھ رہا ہوں اکثر میں خالی دفتروں میں جا کر بیٹھ جاتا ہوں اور
کیتھرائنڈ گورینز کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ چیزوں کے خاموش
وجود کو محسوس کرتا رہتا ہوں۔ آپ نے بارہا میرا نفسیاتی مطالعہ اولڈ
میڈ سائیکالوجی کے بیسس پر کیا ہوگا۔ انٹلیکچول قسم کی گفتگو سے
قہوہ برج کے دور میں ادھیڑ عمر کے شادی شدہ لوگوں میں جو بیٹھے
ایک دوسرے سے فلرٹ کرتے رہتے ہیں۔ پکاسو، جیمس، جوائس، رسالہ
ملت بیضا، اٹلی کی نیو کلاسزم ڈچ فن کاروں کی تصویریں آدرش،
نہرو خاندان کی پالٹکس، گورنمنٹ ہاؤس کے ایٹ ہوم، ڈپلومیٹک
علاوہ شو، حماقت زدہ عالمگیر سیاست، موسیٰ، انڈونیشیا ملک کے
اقتصادی مسائل سائینٹ، کرسمس بون فائر، عادتی کیمپ، شوگر روم
کامن روم پارٹی اور سلو والک کے در تحت، یوکلپٹس کے نیچے تعلقہ داروں
کی ایسوسی ایشن اور امبیسڈر۔ یہ آپ نے لیڈی لاونگ اسٹائل سے
کلک کرتے ہوئے فلسفے کے موڈ میں ہال کی تیز آرک لائٹس میں جیب کو

بن جانسن کا مشہور نغمہ بج رہا ہوگا۔ اور آپ میڈونا کی طرح خاموش
آرٹسٹک انداز میں کوٹنگ کوبنگ، سلو سلو ٹوکس ٹرڈرٹ ڈالوں گرینڈ
قسم کے کونسرٹ ہیں، اپنے فیشن اینڈ بیوٹی ویمن اینڈ ہوم کے ملاٹو
کے مطابق کوک ٹیل تیار کرانے میں مصروف ہوں گی یا دولے کی دھیمی
آواز پہ غور کر رہی ہوں گی کہ "آہ یہ نہ بھریں گے ریکارڈ پہ بہترین
والز ہو سکتا ہے اور ساتھ ہی ڈانسٹریشن ڈانس بھی کیا جاسکتا ہے
خوشبوؤں اور فٹ لائٹس کی روشنی میں گیو رنگ ایک کرنے میں کوئی
روز کے گرین روم میں آپ پر نہایت اچھوتی قسم کے فلسفہ کا دورہ پڑ رہا
ہو اور ٹینگو ختم کے ڈانس کیبرے اور وائلن کے بیمار سُروں پہ آپ
معہ اپنے ساری آئیڈیلیس کے پٹیون کر رہی ہوں۔
مگر یہ یعنی گلیمر لوائے یعنی بھورا چھ ہا۔ جس کے یہاں بقول آپکے
بے حد اہم مہمان بس آتے ہی والے ہیں، اور میں جو ایک مینگو میں آم
کی آئس کریم کی تیاری کے وقفوں میں قلابازیوں کی مشق کر کے کسی نہ
کسی کو ضرور غلط نمبر پر ڈائل کر چکا ہوں۔ اور اب نہایت مصروفیت
سے چائے پینے بیٹھ گیا ہوں ——— پرو بلم چائلڈ کی طرح ———
اسکینڈل زدہ اینا ٹیگلو بیڈ یا بنا ہوا اپنی بڑی کالی پلکیں جھپکا رہا ہوں
میں نے اپنے مونکل اتار کر بیک کیپ ایک جانب ہوا میں اچھال
دی ہے۔ جیسے میری ہستی گم ہو چکی ہے کیوں کہ ابھی تھوڑی دیر میں
مینگو پارٹی ختم ہو جائے گی۔ اور دھوبی ڈے شروع ہو جائے گا

جس کے اختتام پر میں ہلکا پھلکا شب بخیر کہہ کر یہاں سے چل دوں گا۔
اور باغ میں جا کر ناک پر سنترے بیلنس کرنے کی مشق شروع کر دوں گا

باغ میں انگور کے بیل کے پتوں کی سرسراہٹ ہے، برکھا کی جھڑیں
برس رہی ہوں گی، ہرے لان میں اونچے اونچے بارشوں میں جھومتے ہوئے
اشوک کے درخت لہرا رہے ہوں گے۔ سامنے سرخ خیالی پتھر والے
فوارے پر نارنجی تانبے کا فرشتہ اپنا بربط لیے حسبِ معمول ایک ستون
پر چڑھا بیٹھا ہوگا۔ ہولی ہوکس کے پودے لہرا رہے ہوں گے۔ تیتری
اور سویٹ پی کے شگوفے کھل رہے ہوں گے۔

اور میں یعنی گیمبروائے یعنی سب کا فرسٹ کزن جس کی خدمت
کے لیے فی الحال نہ کوئی گل شبو ہے نہ حسینی خانم، نہ عباسی خانم اور
نہ شعلہ پری، نہ عمدہ گھوڑوں اور نئی قسم کے ہوائی جہازوں کے خواب
ہیں۔ نہ فلائنگ کلب اور تیز ماڈلس کے موٹر ——— ان سب سے
دور بہت دور رچمنڈ ٹولیا کوارٹرز میں واقعی نہایت مصروفیت سے چائے
پینے بیٹھ چکا ہوں، گو کہ دن بھر نچلے کے چائے خانے میں یوں بھی ریڈیو
سیلون کے ریکارڈس پر والز کرتا ہے۔ آج مجھے ایمپلائمنٹ ایکسچینج
بھی نہیں جانا ہے، کیوں کہ ابھی وہ مجھے کال ہنس کر رہے ہیں۔ فی الحال
میں کوارٹرز کے مشترکہ زینوں کی بچلی سیڑھیوں پر ایک قدم اوپر
رکھے چوقوں کی طرح چپکا کھڑا ہوں۔ مگر اس وقت میری خواہش
ہے کہ کسی پبلک ہال کو کرایے پر لے کر عین اس کے وسط میں قلابازیاں

کھاؤں، یا چھت میں لٹک جاؤں ——— بالکل ایک ناکام، اُجاڑ
اداس اور رنجیدہ کردار کی طرح جو ان سیڑھیوں سے وقت کے آبشار
کی طرح سرسراتا ہوا نیچے گر رہا ہو ۔ اور منھ کے بل گرنے کے بعد چلّا چلّا کر
کہوں کہ میں یعنی گلیمر بوائے خود نہایت اعلیٰ قسم کی بکواس ہوں فقط

ایڈیٹر
انسائیکلوپیڈیا د لیکنڈ
گلیمر بوائے